احمد ندیم قاسمی

شعلۂ گل

شعلۂ گُل

شعلۂ گل

(شاعری)

احمد ندیم قاسمی

اساطیر۔ لاہور

کتاب	شعلۂ گل (شاعری)
اہتمام	منصورہ احمد (اساطیر)
کتابت	محمد حسین شاہ
سرورق	آغا نثار
مطبع	شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور
تعداد	ایک ہزار
سنہ اشاعت	مارچ 2000 (بتیسواں ایڈیشن)
قیمت	180روپے

اساطیر

میاں چیمبرز، 3 ٹیمپل روڈ، لاہور

فون 6304820

سبطِ حسن کے نام!

ع

ما و چراغِ چشم و رہِ انتظارِ دوست

فہرست

(۲)

(۳)

(۴)

(۵) غزلیں

(۶)

تعارف

ندیم اب اس منزل سے بہت آگے گزر چکا ہے، جس پر کسی ادیب اور شاعر کا تعارف ضروری ہوتا ہے۔ اس کی شاعری اکثر نقادانِ فن اور عام سخن فہم حضرات سے اعتراف اور تحسین کا خراج حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اب اُس نے ایسی کروٹ لی ہے، کہ اس کی طرف سخن فہموں کی توجہ مبذول کرانا غالباً بے موقع نہ ہوگا۔

اُردو شاعری میں مقصدیت کے پہلے علمبردار خواجہ حالیؔ ہیں۔ ان کے بعد اقبالؔ نے اس تحریک کو بے انتہا تقویت دی، اور شاعروں اور ادیبوں کی ایک پوری نسل کو مقصدیت کا قائل بنا کر ادب اور زندگی کا رشتہ استوار کر دیا۔ میں بعض نئے نقادوں کی طرح مقصد کی عصبیت اور جانب داری کے مرض میں مبتلا نہیں ہوں کہ پرانے شعراء میں سے کسی کو رجعت پسند اور کسی کو ترقی پسند قرار دینے لگوں، اور اس امر کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لوں۔ کہ کسی شاعر کا ماحول کیا تھا؛ اور اس میں زندگی کے تقاضے کیا تھے۔ میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر نے اپنے ماحول کو کس حد تک متاثر کیا؛ اور فکر کی رفتار کو کس حد تک معاصر زندگی کے مقصد اور تقاضے کے مطابق ترقی دی۔ بلاشبہ اقدار کی صحت مندی اوّلیں معیار ہے۔ لیکن صحت مندی بھی تو بعض اوقات اضافی اور اعتباری ہو جاتی ہے۔ اگر حالیؔ اور اقبالؔ پیدا نہ ہوئے ہوتے، تو ظاہر ہے کہ اُردو کے شعرا کے لیے قدامت اور بے مقصدی کے جال سے مخلصی پا کر اُس منزل پر پہنچنا جس پر وہ آج ہیں، بے حد دشوار ہوتا۔

بلاشبہ اقلیمِ اُردو میں یہ عہد اقبالؔ کا عہد ہے۔ اور اس کا اثر ہر گوشے پر چھایا ہوا معلوم

ہوتا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مفکر، مبلغ اور شاعر کی حیثیت سے اقبال کا پایہ بہت بلند ہے۔ ایسے عہد میں کسی نوجوان شاعر کا فکر اور اظہار دونوں دائروں میں اپنا ایک الگ رستہ نکال لینا اور پھر نقادوں سے اپنا لوہا منوا لینا حقیقت میں بہت بڑی کامیابی ہے۔ ایسی کامیابی کسی دوسرے درجے کے شاعر کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے کوئی "نابغہ" ہی درکار رہے۔ چنانچہ ندیم کے فکر کی رفتار اور اس کی جدتِ اظہار اسی "نابغہ" کا پتہ دیتی ہے۔

میں ندیم کی شاعری کے ارتقا کی تمام منزلوں سے آشنا ہوں۔ میں نے اس کو گھٹنیوں چلتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور آج اس کے ثباتِ قدم اور سرعتِ رفتار کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ اس کی شاعری اپنی اوّلیں منزلوں پر اگرچہ پرانوں کی سلامت روی اور روایت نوازی کا آئینہ تھی لیکن اہلِ نظر اس میں مستقبل کے روشن امکانات دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد ایک ایسا زمانہ آیا۔ جب شدتِ احساس، ناپختگیِ فکر اور ضعفِ اظہار تینوں نے مل کر ندیم کے ذہن میں بے شمار الجھنیں پیدا کر دیں۔ میں نے بارہا ندیم کے روبرو اس کی اس تمام نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کیا اور "جلال و جمال" کی بعض نظموں کی ژولیدگی اور عسیر الفہمی کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس تجزیہ و تحلیل سے اس کی الجھنوں میں تخفیف کے بجائے کچھ اضافہ ہی کر دیا ہے۔ بہرحال میں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ کیفیت غالباً سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ رہی۔ اور مطالعہ، صحبت اور غور و فکر نے اس کے دماغ کے جالوں کو صاف کرنا شروع کیا۔ اب اسے اپنی شاعری کا مقصد واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس کے ذہن نے بہت سے مسائل کا حل تلاش کر لیا تھا وہ مابعد الطبیعی جنگلوں سے نکل کر طبیعی فضا میں سانس لینے لگا تھا۔ اوہام کی جگہ حقائق نے لے لی تھی۔ "خدا اور انسان"۔ "انسان اور انسان" اور "انسان اور فطرت" کے روابط اس کی سمجھ میں آنے لگے تھے اور اس کے دماغ میں ایک تندرست اور صحت مند ذہن پرورش پا رہا تھا۔

اس دور کی نظموں میں ظلمت اور پیچیدگی بہت کم ہو چکی تھی۔ روشنی کی کرنیں جابجا پھوٹ

رہی تھیں۔ زندگی کے سنگین حقائق، انسان کے بنیادی مصائب اور اُن کے مداوا کا عرفان صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی انسان نوازی قدم قدم پر اُجاگر ہو رہی تھی۔ اور اس نے جبر و استبداد، عدم مساوات، استحصال اور نام نہاد تہذیبِ انسانی کے جہل کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تھا۔

"شعلۂ گل" میں ندیم کا اسلوبِ اظہار "جلال و جمال" کے مقابلے میں بہت واضح، دلیرانہ اور قطعی ہے۔ فکر بھی چھیل چھلا کر اور تراش تراشا کر ایک نظر فریب پیکرِ کامل کی شکل میں جلوہ گر ہے اب اس مجموعے کو پڑھ کر کوئی شخص یہ نتائج نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ندیم انسان کی عظمت کا بہت بڑا معترف ہے۔ وہ ساری کائنات کو انسان کے مغلوبات و مسخرات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ وہ شہنشاہی، جاگیرداری، سرمایہ داری، جبر و ظلم اور استحصال کا سخت دشمن ہے۔ وہ معاشرے میں بہت بڑا انقلاب دیکھنا چاہتا ہے تاکہ انسان اس سطحِ ارضی پر اپنی تقدیر کا مالک آپ بن جائے۔ وہ پرانی اقدارِ تمدن پر بے پناہ حملے کرتا ہے۔ اور ان اداروں کو پاش پاش کر دینا چاہتا ہے۔ جو انسان کی غلامی، مظلومی اور ذلّت کے باعث ہوئے ہیں۔ غرض اس کا فکر ایک فکرِ تازہ اور اس کا احساس ایک احساسِ جدید ہے۔ وہ محبّت کو بھی ناقدانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ جذباتیت کو عُلوِ ادراک کے ماتحت رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ اس کے نزدیک فطرت بے حد حسین ہے۔ اور عورت تمام مظاہرِ فطرت سے زیادہ حسین ہے لیکن اس معاملے میں اس کا احساس مریضانہ نہیں۔ وہ خود گدازی کا قائل نہیں، آہن گدازی کا نقیب ہے۔ اس کی غزل کا نقشہ بھی کھرا کھرا ہے۔ پُرانے غزل گووں کے کلام کی طرح چپٹا نہیں۔ اس کی غزل میں سوز تو ہے، لیکن گداز نہیں۔ درد تو ہے لیکن نالہ نہیں۔ بلاشبہ پرانے نقادوں اور شاعروں کو ندیم کے کلام کے مطالعہ میں اکثر ٹھوکریں لگیں گی انھیں جابجا چونکا دینے والے خیالات ملیں گے۔ جو انھوں نے پہلے کبھی نہیں سنے۔ وہ بدیع و جدید

اسالیب اظہار نظر آئیں گے جن کو وہ قدیم فنِ بلاغت کے مطابق نہ پائیں گے۔ ندیم کی تشبیہات، ندیم کے استعارے، ندیم کے کنائے، "حدایق البلاغت" کے دائرے سے اکثر تجاوز کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ لیکن جن کو ادب و شعر کی تاریخ اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کا معمولی علم بھی ہے، وہ ندیم کی جدّت و بداعت کا خیر مقدم کریں گے۔ ندیم نے ہماری شاعری میں نہایت گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ اس نے اظہار کے کئی نئے راستے دکھائے ہیں۔ وہ وزن و بحر اور قافیہ ردیف وغیرہ کے معاملے میں بھی صرف اسی قدر تجاوز یا انحراف کا روادار ہے، جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے۔ وہ اُن کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات ان کے محلِ استعمال میں ایسا اجتہاد کرتا ہے کہ پرانے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ انھیں انکار و اعتراض کی جراُت نہیں ہوتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ "شعلۂ گل" ندیم کی شاعری کے تیسرے دَور کا "سنگِ میل" ہے اور اس کی شاعری اب اپنے نقطۂ کمال کے قریب پہنچ گئی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اسے ابھی اس وادی کے بڑے بڑے میدان طے کرنے ہیں۔ میں نے "جلال و جمال" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"ایشیا کے افق پر ایک عظیم شاعر نمودار ہوا ہے"

"شعلۂ گل" نے میرے اس فقرے کی صداقت واضح کر دی ہے، اور ندیم کے آئندہ مجموعے متعصب سے متعصب منکر کو بھی اس حقیقت کا قائل بنا دیں گے کہ وہ حقیقت میں ایک عظیم شاعر ہے۔

کراچی۔ ۶ ستمبر ۱۹۵۲ء

عبدالمجید سالک

ایک "نیا منصور"

میں کوئی سائنس دان نہیں لیکن میرا مزاج ایک سائنس دان کا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کوئی مذہبی آدمی نہیں لیکن ان کا مزاج مذہبی ہے۔ ممکن ہے مجھے یہ فرق اس لیے نظر آتا ہو کہ وہ شاعر ہیں اور میں ایک معمولی نثر نگار۔ ان کا کام احساسات کو قلمبند کرنا۔ ان احساسات کو بھی چھونا جو کبھی کبھی ادراک کی دسترس سے بھی باہر معلوم ہوتے ہیں۔ اور میرا کام صرف ادراک کی رہبری میں ان احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا جنھیں وہ یا دوسرے شعرا اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہیں لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے تھوڑا سا ہم دونوں کا انداز نظر مختلف ہے لیکن وہ جزوی اختلاف زندگی اور فن کے میدان میں اتنا غیر اہم ہے کہ میں نے آج تک اس پر غور بھی نہیں کیا کہ یہ شخص جو انقلاب کا نقیب، ارتقاء کا پرستار، ظلم و استحصال کا مخالف اور انسانیت کا شیدا ہے، ایک آدھ باتوں میں مجھ سے کچھ مختلف رائے رکھتا ہے اور یہ اختلاف مجھے اس لیے بھی نظر نہیں آیا کہ میں رومان رولان، ڈین آف کینٹربری اور گورکی کی منزلوں میں کوئی خاص فرق نہیں نکال پاتا ہوں۔

بہر حال اب جبکہ یہ مجموعہ شعلۂ گل "کتاب الطواسین" ہی ٹھہری تو اس بات کے اظہار میں حرج ہی کیا ہے جو میرے اور ان کے طریقِ فکر میں تنوع پیدا کرتی ہے، جو مختلف راہوں کو ایک ہی منزل سے ملاتی ہے۔ میں اس کائنات میں صرف ایک ہی طاقت کو دیکھ پاتا ہوں۔ وہ طاقت انسان کی ہے جو باوجود جزوِ فطرت ہونے کے فطرت کا خالق بھی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حیاتِ فطرت کے ارتقاء کی ایک حسین اور ابھی تک کسی قدر پُر اسرار تخلیق ہے لیکن اس تخلیق سے زیادہ شاندار انسانیت کی تخلیق اور انسان کا ارتقا ہے اور یہ کارنامہ حضرتِ انسان کا اپنا ہے۔

ع "لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں"۔ اس ذوقِ تجسس کو اسی نا آفریدہ (رومی) انسان نے جنم دیا ہے۔ کسی کھوہ یا غار میں بیٹھ کر نہیں بلکہ چلچلاتی دھوپ اور یخ بستہ سردیوں میں اپنے وجود کو زندہ رکھنے اور جماعتی اعتبار سے ترقی کرنے کے طریق کار میں۔ وہ تمام پُر اسرار سائے جو کہکشاں کے خیابانوں سے چھپ چھپ کر نکلے، کف آلود سمندر کی موجوں پر ناچتے تھرکتے آئے اور ہمارے اعصاب پر احساس بن کر چھا گئے۔ فطرت اور انسان کے ایک سماجی رشتے سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ رشتہ غالب اور مغلوب کا تھا نہ کہ خالق اور مخلوق کا۔ اور اب جبکہ انسان فاتح اور فطرت مفتوح ہوتی جا رہی ہے، وہ سارے احساسات جو اعصاب سے گزر کر دل و دماغ میں اُتر چکے تھے حتیٰ کہ نظامِ فکر میں ڈھل چکے تھے، اب ایک نئی نفسیاتی بالیدگی میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اب وہ خوف و دہشت اور احساسِ کمتری پیدا کرنے کے بجائے اس احساس میں تبدیل ہو چکے ہیں کہ آسمان کی پہنائی وہ نہیں جہاں تک ہماری نظر جاتی ہے اور ذرّات کی ماہیت وہ نہیں جو بظاہر نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس

آج انسان کی نگاہیں ان بے شمار کرۂ نور اور حقیقتوں کو دیکھتی ہیں جو کبھی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھیں۔ کیا اس سے اس بات کا یقین نہیں بڑھتا ہے کہ حقیقت کے تمام پردے روز بروز اُٹھتے جائیں گے اور وہ تمام رازہائے سربستہ جن کے بارے میں یہ گمان تھا کہ "کس نکشود و نکشاید" آج کھلتے جارہے ہیں۔ مادی علوم کے جلو میں نہ کہ کسی صاحبِ نظر کی رہنمائی میں، زندگی کا لطف حقیقت کے چہرے سے نقاب اُلٹنے میں ہے نہ کہ اس خوف اور سراسیمگی میں مر مر کر جینے میں کہ نہ جانے اس نقاب کے پیچھے کون سی طاقت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حقیقتوں کے پردے کسی صاحبِ کرامات کی نظر نے نہیں اُٹھائے ہیں، جبکہ آج تک کوئی صاحبِ نظر ابر و باد و باراں کو اسیر نہ کرسکا، تانبے کو سونے میں اور مشتِ خاک کو عنبر دیا قوت میں تبدیل نہ کرسکا۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے کہ وہ کہکشاں کی گتھیوں کو سلجھائے گا اور وجودِ عالم، حیات و ممات اور ارتقا پر روشنی ڈالے گا۔ کیا یہ تلخ حقیقت تاریخ کے صفحات سے یہ اعلان نہیں کرتی کہ ہمارا صوفی جو کبھی جدلیاتی مفکر اور ریشنلسٹ بھی تھا جب امام غزالی کی کوششوں سے یونان کے مادی علوم سے محروم ہوگیا تو ہمارے معاشرے سے اس کی افادیت بھی زائل ہوگئی۔ وہ سوفسطٹ ہونے کے بجائے صرف صوفی صافی رہ گیا۔ اس کی انسان دوستی نسبتاً ہمیں عزیز ہے۔ لیکن اس کی یاد رہو ار دحانیت اور بے علم بصارت کے ذریعے ہمیں اتنا ہی نقصان پہنچا ہے جتنا کہ صاحبانِ شریعت کی کجکلاہی، تنگ نظری اور علم دشمنی سے پہنچا ہے۔

اس چیز کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی حلاج، حافظ رومی اور محی الدین ابن العربی کی طرح وحدت الوجودی عقیدے کے قائل ہیں۔

تیرگیاں، تجلیاں محض فریبِ امتیاز
ایک ہی آفتاب جب مبدءِ معجزات ہے

اور وہ اسی راہ سے ان بزرگوں کی طرح انسانیت کی وحدت کے بھی قائل ہیں لیکن ان کا یہ عقیدہ بجز چند نظموں کے اور کہیں عام نہیں۔ اس کے برعکس ان کے سامنے براہِ راست انسانی تاریخ کے معرکے اور دورِ حاضر کے انسانوں کی وہ زندگی ہے جو ظلم و جبر، استحصال، غلامی اور نسلی اور ملّی تنفّر کے خلاف جدوجہد کر کے انسانیت کو ایک نئی وحدت کے رشتے میں پرو رہی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر خدا کے تصور کو سزا و جزا، قانون اور شریعت جنّت اور جہنّم مختصر یہ کہ ایسے تمام تصوّرات سے آزاد کر دیا جائے جن سے استحصال کو قائم رکھنے، سماج میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنے اور سائنس کی قدروں کو آگے بڑھانے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو خدا، انسان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال کچھ احمد ندیم قاسمی ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے دوسرے انقلابی شعرا کا رہ چکا ہے۔ اس کی ایک مثال سوویٹ روس کے انقلابی شاعر بورس پیسترناک کی ذات میں بھی ملتی ہے وہ تمام عمر وحدت الوجودی عقیدے کا حامل رہا۔ لیکن انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد ہمیشہ ہی اشتراکی انقلاب کی حمایت کرتا رہا۔ بہر حال جہاں تک احمد ندیم قاسمی کا تعلق ہے انھوں نے اپنی ایک نظم میں اسی عقیدے کے ماتحت انسان اور خدا کا موازنہ اس طرح کیا ہے کہ خدا کا انسان کی راہ میں حائل ہونا تو ایک طرف رہا انھوں نے انسان کو زیادہ حسین اور طاقتور بتلایا ہے ؎

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے ۔۔۔ تو آگ ہے اور وہ اُجالا
تو نم ہے نمو کا پاسباں وہ ۔۔۔ تو دشت ہے وہ چراغِ لالہ

انساں نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا
تو عینِ حیات ہے مگر وہ تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا
تو وقت ہے روح ہے بقا ہے وہ حسن ہے رنگ ہے صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

یہاں احمد ندیم قاسمی کی فکر علامہ اقبالؒ کی فکر سے زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔ یوں تو علامہ اقبال بھی حلاج اور محی الدین ابن العربی کے خیالات سے کافی متاثر تھے، اور انھوں نے بھی انسانی عظمت کے ترانے گائے ہیں، لیکن جب وہ امام غزالی اور مجدد الف ثانی سرہندی کے ہاتھوں پر بیعت کر لیتے ہیں اور اس رو میں مادی فلسفے سے کنارہ کش ہونے لگتے ہیں تو وہ اپنے عظیم انسان کو نیابتِ الٰہی کا کچھ ایسا پابند کر دیتے ہیں کہ اس کی ساری پرواز بے معنی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس کی شعور آزمائی کو ایک ایسے روحانی ارتقا کا نام دے سکتے ہیں جو مادی فتوحات اور مادی علم سے کٹ کر صرف منطقی دائرے میں گھر کر رہ جاتی ہے۔ بات کہنے کو اور وہ بھی شعر میں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن زندگی پا بہ جولاں، ارتقا، سسکتی پرانے ہی رشتوں میں ہر پھر کر اسیر رہتی ہے۔

قاسمی نے اس تشریع صوفیانہ روایت سے علحدہ اپنی راہ نکالی ہے ۔ وہ دورِ حاضر کے اس طبقے کو اپنے خالق کے پہلو میں بٹھانا چاہتا ہے جس کی محنت سے سینۂ گیتی میں نور چمکا ہے، اور روح پیدا ہوئی ہے اور جس کے بازوؤں کی صلابت اور علم کی حدت سے لوہا پانی کی طرح پگھل کر انسانی تخیل کے سامنے ایک نئی صورت کا منتظر رہتا ہے ۔ یہ اسی طبقے کی کڑی جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ انسان شعوری طور پر اپنی تاریخ کا خالق بن رہا ہے اور یہ اسی کے دست و بازو کی پیہم محنتوں کا نتیجہ ہے کہ زمان و مکان دونوں ہی آج اپنے بازوؤں کو پھیلانے اور سمیٹنے کی انسان سے اجازت طلب کر رہے ہیں ؎

مجھے محنت کشوں کو دہر کا آقا بنانا ہے
مجھے تخلیق کو خالق کے پہلو میں بٹھانا ہے

وہ اُٹھے قافلہ در قافلہ پورب سے پچھم سے
وہ لپکے کارواں در کارواں اقصائے عالم سے

ملوں سے، مرغزاروں سے، بنوں سے کوہساروں سے
دکانوں سے گھروں سے، علم و دانش کے اداروں سے

خلش ان کے دلوں میں، اجتہاد ان کی نگاہوں میں
بچھی جاتی ہیں جمہوری روایات ان کی راہوں میں

مرا فن ان کی عظمت کا جب استقبال کرتا ہے
تو استحصال مجھ پر کفر کا الزام دھرتا ہے

اگر یہ کفر ہے اس کفر کو ایماں بناؤں گا
بجز دم ظلمتِ شب کے ترانے میں نہ گاؤں گا

یہ جو ندیم کے لہجے میں تیزی پیدا ہوئی ہے وہ اس کی رسیلی اور مدھم طبیعت کے خلاف توقع ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی آواز اتنی بلند نہ ہوتی اگر اس کے مخصوص ماحول نے زندگی کا ساتھ دینے پر اسے عقیدوں سے ڈرایا دھمکایا نہ ہوتا۔ اور اگر استحصال کی طاقتوں اور حکومت کے جبر نے عین اس وقت جبکہ وہ تزئینِ حیات میں مصروف تھا، اس کے پاؤں میں زنجیر نہ ڈالی ہوتی۔ بہر حال اس کی آواز کی تیزی اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر خدا کے نام پر انسانوں کو استحصال اور غلامی سے آزاد ہونے میں روکا گیا تو وہ ایسے جلال و جبروت کا ساتھ دے گا کہ دار و رسن اور جیل کی دیواریں تو ایک طرف رہیں ایٹم بم کو بھی روندتا ہوا ان لوگوں کے گریبانوں تک جا پہنچے گا جو اسے غلام رکھنے کی مختلف راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ اس جلال کی ایک ہلکی سی جھلک قاسمی کے ان اشعار میں موجود ہے۔

آج سلجھائے گی جمہور کی آواز سے
تم نے تاریخ میں جس بات کو الجھایا ہے

اب مرا ذوق کسی قید کا پابند نہیں
تم نے صدیوں مرے وجدان کو ترسایا ہے

نوعِ انساں کے نئے عزم کی تکریم کرو
جب کہ ذرّہ بھی قیامت کی خبر لایا ہے

تم ہی کہہ دو کہ سمندر ہے کف آلود سا کیوں
کیا چٹانوں سے سفینہ کوئی ٹکرایا ہے

قاسمی جلال و جمال دونوں ہی کا شاعر ہے۔ اور وہ زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو نظم اور غزل میں یکساں طور پر پیش کرتا ہے۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ جمالیاتی قدروں کا جتنا نکھار ان کی غزلوں میں ہے وہ نظم میں نہیں ہے۔ غزل کے بارے میں مختلف لوگوں کا خیال ہے کچھ لوگ اس کے کینوس کے اختصار اور اس کی اشاریتی زبان کے باعث اس کے مستقبل سے مایوس ہیں، کچھ لوگ ان دنوں کی مخصوص سیاسی فضا اور ہماری ادبی روایات کی تنگ دامنی کے مدِ نظر اس کے مستقبل سے

بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ یہاں میں ان دونوں پر کسی تنقید کے بغیر صرف اس حقیقت کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ادھر سال دو سال میں ہماری غزلوں میں ایک ایسی توانائی اور نکھار پیدا ہو گیا ہے جس کی توقع بہت کم لوگوں کو تھی۔ غزل میں سیاسی فضا کو ضم کرنے کی کوشش بہت دنوں سے کی جا رہی ہے، لیکن اس میں جو گھلاوٹ اور حلاوت ان دنوں پیدا ہو چلی ہے وہ اگلے وقت کی سیاسی رنگ کی غزلوں میں نہیں ملتی۔ اس رنگ کو چمکانے میں اگر ایک طرف فراق گورکھپوری اور فیض احمد فیض کا ہاتھ ہے تو دوسری طرف احمد ندیم قاسمی کا بھی ہاتھ ہے۔ قاسمی کا خیال ہے کہ "شاعری حقیقت کا سنگھار" ہے۔ اور ترنّم شاعری کا زیور ہے۔ میں قاسمی کے اس خیال سے بالکل متفق ہوں اور بھلا اتفاق کیوں نہ کروں، جبکہ انھوں نے اپنے اس دعوے کو عملی اعتبار سے پیش کیا ہے۔ ۴۷ء کے بعد کی سیاسی فضا کو جس حسن و نغمہ کے ساتھ انھوں نے غزل کا لباس پہنایا ہے، کچھ اُنہی کا کام ہے۔ ان کا پیرایۂ بیان کس قدر لطیف اور ابہام سے پاک و صاف ہے ؎

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے — ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں — آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب — کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے
پھر وہی اختر شماری کا نظام — ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے
آدمی کے ارتقا کا مدّعا — وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے
اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر — آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

قاسمی کی غزلوں میں یہ لطافت اور حلاوت بنیادی طور پر اس بات سے پیدا ہوئی ہے کہ وہ اپنے شعور کو اس راہ سے گزارتا ہے۔ جس پر لاکھوں ہی دل تڑپے

اور دھڑکے ہیں اور جہاں احساسات کے کشتے صرف ایک زبان کے متمنی ہوتے ہیں۔
قاسمی کی شاعری انہی لکھو کھا انسانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے لیکن اس انداز سے نہیں کہ جذبات خیالات کی صداقت میں بندھ نہ سکیں اور احساسات مبہم تاثرات کے دھندلکے میں پسٹ کر رہ جائیں۔ قاسمی نے یہیں پر غزل میں اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے ؎

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگزر کا ذکر کریں

یہاں اس کا شعور اور وجدان (جس کا وہ قائل ہے) ایک اکائی میں سمٹ کر پوری زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ شعر فکری اعتبار سے کتنا بلند اور ساتھ ہی ساتھ احساسات کی کتنی لطافتوں کا حامل ہے۔

قاسمی کی شاعری میں جہاں انسانوں کی دُکھی زندگی کا عکس ہے جو زندگی کے خالق اور معمار ہیں وہاں زہرہ جبینوں کا وہ لطفِ خرام اور آرائشِ کاکل بھی ہے جو بہیمت کو تہذیب، سختی کو نرمی اور ہوس کو خلوص میں بدل دیتی ہے۔ قاسمی کی عشقیہ شاعری بڑی پاکیزہ اور طاہر ہے۔ اور اس طہارتِ نفس کا نتیجہ ہے جو روح اور جسم کو پیوند کر کے محبت کرنے کا چلن بتاتی ہے۔

قاسمی نے چھتیس سال کی عمر میں شاعرانہ فکر کی جن بلندیوں کو چھُوا ہے۔ وہاں تک رسائی اس عمر میں بہت کم شعراء کو ہوئی لیکن میں اس بات پر مسرور ہونے کے بجائے اس سے خوش ہوں کہ اب ان کی روح جوان ہو چلی ہے۔ اب انھیں اس کا بھرپور احساس ہُوا ہے کہ یہ انسان اپنی خودنگری اور خودسفری میں کس قدر جمیل و جلیل ہے اور اس کے فکر کی کمند کس قدر بیباک اور یزداں شکار ہے۔ اس انسان کو شاعری کا ہیرو بنانے کے لیے انھیں ابھی اس کے فکر اور قوت کی بلندیوں کو چھونا ہے اور اپنے خیالات کے اظہار

کے لیے ایسے پیکر تراشنے ہیں جو تخیل کی خود ساختہ حکایت کے روپ میں ہوں۔ یہ پیرایۂ بیان یا فارم فکری شاعری کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں الفاظ کے انتخاب اور ان کے در و بست پر وہ اقتدار حاصل کرنا ہے، جو کسی بھی عظیم المرتبت شاعر کا خاصہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی حیثیت ان ناشگفتہ پھولوں کی ہے، جو خیال کی تحریک سے بقدر حکم اپنی پنکھڑیوں کو کھولتے اور سمیٹتے ہیں۔ قاسمی روز بروز اس فن کاری کی طرف بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے وہ دن دور نظر نہیں آتا جبکہ یہ آوازیں سنائی دیں گی۔ "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"، کس کی دلیل، مردِ مومن کی دلیل میں انسان کی دلیل، جو کامل بھی ہے اور ناقص بھی۔ اور جس کی بستی ہیں ساری گیتی جہاں حیات تخلیق کی جا رہی ہے اور جہاں آزادی کے لیے جد و جہد ہو رہی ہے۔ قاسمی کا یہی اسلام اور یہی کفر ہے۔ اس پر تنقید کرنے سے پہلے اس کے اس شعر کو نہ بھولیے ؎

آزادیوں کا زمزمہ خواں ہے مرا کلام
محکوم دوست جرأتِ نقد و نظر نہ کر

کراچی۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۵۲ء

ممتاز حسین

(۱)

عجب کہ حوصلۂ روزگار برتابد
اگر بروں فگنم آنچہ در درونِ من است

(فیضی)

لمحہ بہ لمحہ

ریستوران کے فرش پہ لرزاں سائے رقّاصاؤں کے
ذہن میں جیسے گڈمڈ ہو کر ناچیں راز خداؤں کے
چھنن چھنن چھن! — اے رقّاصہ! فن پر یہ آوازے کیوں؟
جس کی لَو سے پھول لجائیں، اُس چہرے پر غازے کیوں؟
یُوں تک جیسے چاند کی کرنیں، یُوں سُن جیسے ربِّ قدیر
وقت کے اس لمحے کا تأثّر عالم گیر ہے عالم گیر!

(۲)

راوی کی لہروں پہ رواں ہیں قاشیں چاند ستاروں کی
کس منزل کو لپکی یہ نورانی فوج سواروں کی
چپ شپ! — جھکتے تنتے مانجھی! تجھ کو سب ڈانڈوں کی قسم
دھیرے دھیرے ہولے ہولے کاٹ یہ ابرق کا سا جسم
یوں مُڑ جیسے پھول کی پتّی، یوں چل جیسے سرگوشی
وقت کے اس لمحے کا تقاضا مدہوشی ہے مدہوشی

(۳)

کھیتوں کی ہریاول پر یہ دھبے ہیں دہقانوں کے
یا گیتی نے اُگلے بوسیدہ تابوت انسانوں کے
سر سر! دھپ دھپ! اے محنت کش! چھوڑ درانتی توڑ کدال
چاک ہوئی دھرتی کی چھاتی، مجھ کو اس محشر سے نکال
چار طرف سے گھیر چکے ہیں جلتی سانسوں کے پیچاک
وقت کے اس لمحے کی حقیقت آتش ناک ہے آتش ناک

(۴)

یہ کس راجہ کا ایواں ہے ملبے کے انباروں میں
جیسے بلوائی کی بیٹھک لٹے ہوئے بازاروں میں
اُلٹی سانسیں، اُلٹی آہیں! اے راہی! یہ راز ہیں کیا!
پچکے پیٹ، دریدہ رانیں، زیست کے یہ انداز ہیں کیا!
راجہ اُٹھا ڈال کے اپنی بقچی میں فرسودہ کا نظام
وقت کے اس لمحے کا ارادہ خون آشام ہے خون آشام!

(۵)

معصوم انساں کے لاشے پر فتح کے پرچم لہرائے
استبداد کی بیخ کنی میں کتنے انساں کام آئے
ہاریں استبدادی قومیں، لیکن کس کی جیت ہوئی
یورپ کی بے رحم سیاست پورب کی کب میت ہوئی
تمغوں کی تقسیم ہوئی ہے پورب کے بلوانوں میں
"مالِ غنیمت" بستا ہے یورپ کے تمدن خانوں میں

(۶)

نومیدی کی دھند میں غلطاں جگنو احساسات کے ہیں
اوس کے پرّاں قطرے ہیں یا تارے پچھلی رات کے ہیں
جگنو اڑتے شعلے بن کر دھرتی سے ٹکراتے ہیں
جھلمل جھلمل، ڈگمگ ڈگمگ، ہچکولے سے آتے ہیں
موت سے بھڑ جانے کے ارادے، اور جینے کی تیاری
وقت کے اس لمحے کا بلاوا بیداری ہے بیداری

۱۹۴۶ء

صحرائے لیبیا میں

ریگ زریں کے لبادے کو اُڑاتا، رینگا
اک فرنگی کی نئی لاش کے نزدیک رُکا
اک سیہ فام سپاہی کا پُرانا ڈھانچا
اور پرکھا کبھی سینہ، کبھی سر کو جانچا

دیر تک کھلی آنکھوں کی ترازو تھامے
ہڈیاں بجنے لگیں، جھڑنے لگے انگارے
اس کا روندا ہُوا، جھلسا ہُوا پیکر تولا
جب وہ پچتے ہُوئے جبڑے کو ہلا کر بولا

"میرا صحرا، مرا آسیب، مرا سناٹا
میری پستی بھی غلط، تیری بلندی بھی غلط
آج آباد ہُوا ہے ترے دم سے ہمدم
موت نے زیست کے زخموں پہ رکھا ہے مرہم

تُو نے افرنگ کی شاہی کی قسم کھائی تھی
میں نے شاہی کی تباہی کی قسم کھائی تھی
متفق کون نہیں اس پہ کہ ہم دونوں نے
ایک مجبور سپاہی کی قسم کھائی تھی

"زندگی چند عقیدوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان عقیدوں کے تصادم سے ہے عالم میں بہار
کتنی دلچسپ حقیقت ہے یہ اضداد کا حسن
میرے چہرے کی سیاہی ترے چہرے کا نکھار

"رنگ اور نسل کا یہ سحر تو ٹوٹا لیکن
اسی شدت سے ہے قائم تری بیگانہ روی
کتنا شاداب نظر آئے یہ صحرائی مزار
چاکِ ہستی کی اگر مل کے کریں بخیہ گری

"ایک ہی قطرے کا اعجاز نہیں فوّارہ
ایک گھر سے نہیں بستا کوئی قریہ، کوئی شہر
سات رنگوں کے مرکب سے کرن بنتی ہے
ایک ہی رنگ نہیں باعثِ رنگینیٔ دہر"

سنہ ۱۹۴۶ء

ناتمام

کنول کی پیالیوں کو دھول سے لبریز کرنے کو
ہوائیں جھاڑیوں کی آڑ میں گھاتیں لگاتی ہیں
افق پر مرتسم شہتوت کے موہوم سائے کو
اُبھرتے چاند کی کرنیں نمایاں کرتی جاتی ہیں
یہ جگنو اُڑ رہے ہیں، یا بقا کی طعنہ زن پریاں
پلوں کو لوٹ کر میری فنا پر مسکراتی ہیں
ستارہ ٹوٹتا ہے، تیرگی کا پیٹ بھرتا ہے
ارادے پھُوٹتے ہیں، قسمتیں طوفاں اُٹھاتی ہیں
مجھے معلوم ہے، یہ پھول کانٹوں کے نشیمن ہیں
مگر گل چینیوں سے کب امنگیں باز آتی ہیں

نہیں اے ہم نفس! میں جنتِ عرفاں سے باز آیا
مجھے حسنِ مجسّم کا یقیں آتے تو کیوں آئے!

زمیں پر اس لیے بھیجا گیا ہے ابنِ آدم کو
کہ رحمت کے لیے دامن بڑھائے بجلیاں پائے
مشیّت کے مظاہر کا بظاہر مدّعا یہ ہے
کہ انساں چند سایوں کے لیے نابوُد ہو جائے
گُل و گلزار پر جب ثبت ہیں مہریں وراثت کی
تو انساں کنکروں پر لیٹ کر کیا دل کو سمجھائے
میں شاعر ہوں، مجھے تاویل کے حیلے نہیں آتے
قیقہوں کا یقیں کوئی کہاں سے ڈھونڈ کر لائے

یقیں — یعنی جہنّم پر گلستاں کا گماں کرنا
چٹانوں تک کو انبارِ حریر و پرنیاں کہنا
کسی موہوم منزل کے تصوّر میں رواں رہنا
شکستہ تربتوں کو اس مسافت کے نشاں کہنا
نہ آنکھیں کھولنا پل بھر، نہ سننا دل کا واویلا
مصیبت کو مسرّت، ابتلا کو امتحاں کہنا

شکستِ آگہی کو عرش کی عظمت عطا کرنا
تصوّر کو خلاء، عجزِ نظر کو آسماں کہنا
پروں کو کیا کروں، پرواز پر بیٹھے ہیں جب پہرے
مجھے آتا نہیں کنجِ قفس کو آشیاں کہنا

فرشتوں نے اگر سجدہ کیا تھا ابنِ آدم کو
تو اب مسجود کے بارے میں جانے کیا ارادے ہیں
یہاں اک دانۂ گندم نے لُوٹی آبرو اپنی
وہاں مغرب میں صدیوں کے لٹیرے شاہزادے ہیں
یہاں عورت کی ننگی چھاتیوں سے خون رِستا ہے
وہاں کی دیویاؤں کے بھی اطلس کے لبادے ہیں
اگر اک واقعہ ہوتا تو کہتے اتّفاق اس کو
مگر لاکھوں سزائیں اور سزاؤں کے اعادے ہیں
لپکتی بجلیاں سرگوشیاں کرتی ہیں آپس میں
کہ فرزندانِ آدم کتنے بھولے، کتنے سادے ہیں

مری سادہ دلی میرا مقدّر ہی سہی — لیکن
مجھے احساس ہے انساں کی گردوں مقامی کا
نہ جانے مجھ پہ افرنگی کی شاہی کیوں مسلّط ہے
بھلا اک فرض کیا کم تھا مشیّت کی غلامی کا
بغاوت بندگی سے اور آدم کش عناصر سے
یہی چارہ ہے باقی، عمر بھر کی تشنہ کامی کا
زمیں کی دھجّیاں تاروں کی جانب اُڑنے والی ہیں
یہی اب کام دیں گی نوعِ انساں کے پیامی کا
ترے ابہام کے اسرار کو اب فاش کر، ورنہ
قیامت ہی نہ ہو انجام میری ناتمامی کا

۱۹۴۶ء

انسان

خدا عظیم، زمانہ عظیم، وقت عظیم
اگر حقیر ہے کوئی یہاں تو صرف ندیم

وہی ندیم، وہی لاڈلا بہشتوں کا
وہی ندیم، جو مسجود تھا فرشتوں کا

وہ جس نے جبر سے وجدان کو بلند کہا
وہ جس نے وسعتِ عالم کو اک زقند کہا

وہ جس نے جرمِ محبّت کی جب سزا پائی
تو کائنات کے صحراؤں میں بہار آئی

وہ جس نے فرش کو بھی عرش کا جمال دیا
وہ جس نے تند عناصر کو ہنس کے ٹال دیا

بڑھا تو راہیں تراشیں، رُکا تو قصر بنائے
اُڑا تو گیت بکھیرے، جُھکا تو پھول کھلائے

وہ جس کے نام سے عظمت قسم اُٹھاتی ہے
اُسی کی آج خدائی ہنسی اُڑاتی ہے

نہیں — کسی سے بگڑنا مرا سبھاؤ نہیں
مری سرشت میں گلزار ہیں، الاؤ نہیں
ہزار بار شکستوں پہ مسکرایا ہُوں
مصیبتوں کی گرج میں بھی گنگنایا ہُوں

اگر حریمِ بقا سے فنا ملی ہے مجھے
اسی فنا میں بقا کی ادا ملی ہے مجھے
خدا شناس بھی ہوں، اور خود شناس بھی ہوں
خدا سے دُور بھی ہوں، اور خدا کے پاس بھی ہوں

یہاں زمیں پہ بھی تخلیق کام ہے میرا
کہ کبریائی سے منسوب نام ہے میرا
زمیں مری ہے، فضا بھی مری، خلا بھی مری
خلا مری ہے تو اقلیمِ ماورا بھی مری

خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دولھا ہوں میں — ندیمؔ ہوں میں

اپریل ۱۹۴۷ء

مجاز

ایک مٹّی کا دیا لَو کو سنبھالے کب تک
تیل بھی ختم ہے، طوفاں بھی اُمڈ آیا ہے
اے بلندی کے خدا! تونے بنا کر پستی
کیا فقط جذبۂ تخلیق کو بہلایا ہے؟

چھلکا پڑتا ہے ستاروں سے ترا ساغرِ شب
میری قسمت میں فقط ایک چراغِ مردہ
کیا تجھے عرش کی خلوت کا سکوں جچتا ہے
فرش پر ہو ترا محبوب اگر آزردہ؟

شکوہ سنجی مرا مقصود نہیں ربِّ کریم!
خود ترا حکم ہے، اخفائے حقیقت نہ کروں
تو تجلّی کو جو آلودۂ پستی نہ کرے
ایک مٹّی کے دیئے سے بھی محبّت نہ کروں؟

سنہ ۱۹۴۷ء

تاریخ کی آواز

سنسناتے ہیں اندھیرے تو لرزتے کیوں ہو؟
ہر نئی صبح کی تخلیق یونہی ہوتی ہے
رات کی آنکھ سے ڈھلکا ہُوا تاباں آنسُو
در حقیقت مرے جھُومر کا گراں موتی ہے
بطنِ گیتی میں دھڑکتی ہیں تجلّی گاہیں
جب شفق شام کی وادی میں لہو بوتی ہے
کون جانے کہ چٹکنے کی ریاضت ہے یہی
لوگ کہتے ہیں کہ معصوم کلی سوتی ہے

جب کلی چونک کے چٹکی تو گلستانِ جہاں
اک الاؤ کی طرح شعلہ فشاں بھڑکے گا

قدریں بدلیں گی، یقیں بدلیں گے، تم بدلو گے
تیرگی میں بھی تجلّی کا گماں دھڑکے گا

میں تو کہتی ہوں مشیّت بھی تڑپ اُٹھے گی
دستِ انساں سے جب ادراک کا در کھڑکے گا

نکہتِ گُل میں پگھل جائے گا کانٹوں کا وجود
اتنی شدّت سے مرا ابرِ رواں کڑکے گا

۱۹۴۷ء

طلوع

مہیب رات کا آغاز کتنا رنگیں تھا
مہیب رات کا انجام جانے کیا ہوگا

وہ رات جس نے ستاروں سے بھی کنارا کیا
غروبِ مہر کے نظّارۂ حسیں کے بعد
خیال و خواب کے میں نقش ہی ابھارا کیا
میں سوچتا تھا کہ اس تیرگی کے طوفاں میں
کسی کرن نے لپکنا اگر گوارا کیا
تو اس کرن کا نیا نام، جانے کیا ہوگا

بس اک ذرا سی کرن کی مجھے تمنّا تھی
کہ ٹوٹ جائے یہ دیرینہ ظلمتوں کا طلسم
مگر چراغ کی لَو سے لہو نکلنے لگا
کچھ ایسی تند تھی جلتے لہو کی جولانی

جہانِ خواب مرا کروٹیں بدلنے لگا
جب آنکھ کھول کے آفاق پر نظر ڈالی
تو شش جہت سے لہو اس طرح اُبلنے لگا
کہ تنکے بن کے بہے جا رہے تھے سیکڑوں جسم

سلگتے خون میں اک کارواں رواں تھا ہُوا
کسی کے پاس درانتی، کسی کے ہاتھ میں ہل
کسی کی باہوں میں معصومیت کے رکھوالے
لبوں پہ مہم کے تقاضے، گلے میں تیز کٹار
کسی کے ہاتھ حنائی، تو پاؤں میں چھالے
کسی کی اُلٹی ہُوئی پتلیاں، مجسّم پیاس
دریدہ چھاتیوں پر زلفِ خم بہ خم ڈالے
وہ ڈوب ڈوب چلے عفّتوں کے تاج محل

مرے چراغ کی لَو! اے مرے مہتاب کی ضو!
اُمڈتے سیل کا کوئی کنارا ہے کہ نہیں؟

مجھے مہیب اندھیرے کی بے حسی ہی بھلی
یہ زندگی، یہ تمدّن کی ناز پروردہ
لہو میں ڈوب کے کن بستیوں کی سمت چلی
پلٹ کے دیکھ تو آؤں کہ میرے زمنوں میں
چٹک رہی تھی جو انسانیت کی نرم کلی
وہ آج پھول کا رنگیں اشارا ہے کہ نہیں

کلی چٹک بھی چکی، پھول رنگ لا بھی چکا
وہ رنگ جس کو جہاں نے لہو کا نام دیا
مہیب رات شفق میں نہا کے آئی ہے
مہیب رات کا آغاز تھا اگر غازہ
مہیب رات کا انجام بھی حنائی ہے
بجھا بجھا سا نہ دیکھو شہاب پاروں کو
یہ اک عجیب سا احسانِ کبریائی ہے
جو آفتاب دیا ہم کو، لالہ فام دیا

۱۶۔ اگست ۱۹۴۷ء

مہاراج ادھیراج

(دُور اندیش مصاحبین کی درخواست)

مہاراج ادھیراج! خوابوں کی دنیا میں کب تک سنگھاسن اُڑاتے پھریں گے
حضور آپ کب تک گلستاں میں کانٹوں سے دامانِ زرّیں بچاتے پھریں گے
حضور آپ نیندوں میں سرشار ہیں اور دنیا کہاں سے کہاں جا چکی ہے
حضور آپ شاید نہ مانیں مگر آدمیت مشیّت سے ٹکرا چکی ہے
حضور آپ نے خونِ انساں سے اپنے شبستاں کی تاریکیاں دور کی تھیں
حضور آپ نے روٹیاں چھین لی تھیں، حضور آپ نے عصمتیں چُور کی تھیں
حضور آج بھُوکی رعایا نے ایوانِ مرمر پہ یلغار کر دی، سُنا ہے
حضور آپ کی خفتہ بختی نے اک قوم کی قوم بیدار کر دی، سُنا ہے
حضور اب جھروکے سے پردہ اُٹھا کر غریبوں کی وحشت کا نظّارہ کیجے
ارادوں کی شدّت کا اندازہ کیجے، امنگوں کی عظمت کا نظّارہ کیجے
حضور آپ کیوں بوکھلانے لگے ہیں، مکافات پر جب مدارِ جہاں ہے
حضور آپ روپوش ہو جائیں، لیکن حضور آپ کے سر کی کلغی کہاں ہے

۱۹۴۸ء

ثواب سے گناہ تک

فرازِ رہبانیت کا باسی نشیبِ انسانیت میں آیا
تو سنگ ریزے کو پھول، اور پھول کو گلستاں طراز پایا
ندی کی انگڑائیوں میں دیکھی رموزِ فطرت کی بے قراری
تو دھیمے دھیمے سُروں میں رازوں بھری مشیّت کا گیت گایا
فراخ وادی کے سبزہ زاروں کو جب ہواؤں نے تھپکیاں دیں
تو رنگ و نکہت میں ڈوب کر اس کا دشتِ احساس لہلہایا
تنی کھجوروں کی چھتریاں کھول کر جب اُبھرے سنہرے ٹیلے
تو ذہنِ انسانیت کے آتش کدے کا مقصد سمجھ میں آیا
تموّجِ بحرِ بے کراں سے اُچھل کے نکلی جب ایک سیپی
تو آگہی کے عمیق غاروں میں اک ستارہ سا جھلملایا

سکون گاہِ حیات عرفان کی چمک میں نہا رہی تھی
سرور بیدار ہو رہا تھا، شعور کو نیند آ رہی تھی

کلی خیاباں سجا رہی تھی تو ذرّہ صحرا بنا ہُوا تھا
حقیقت اسرار میں سما کر حقیقت اپنی چھپا رہی تھی
زمیں جسے آج تک فلک نے گُنہ کی آماجگہ کہا تھا
خلا میں چکرا رہی تھی، لیکن سکوت کے گیت گا رہی تھی
پہاڑ کی سر بلند چوٹی پہ ابر نیندیں لُٹا رہا تھا
ہوا کے ابریشمی لبادے میں سرخوشی سرسرا رہی تھی
اِدھر خیالوں پہ ریشمی فرغلوں کا انبار لگ رہا تھا
اُدھر افق پر برہنہ انسانیت کھڑی گنگنا رہی تھی

"میں دخترِ کائنات ہوں، شش جہات پر جلوہ بار ہوں میں
نہ جانے کتنے ڈھکے چھپے شعبدوں کی آئینہ دار ہوں میں
مری جبیں میں جھلک رہا ہے کمالِ فن ساحرِ ازل کا
طلسمِ تخلیق کا زمانے میں آخری شاہکار ہوں میں
گنوا کے اک خلد، اَن گنت جنّتوں کو شاداب کر چکی ہوں
یہ مجھ پہ بہتان ہے کہ اپنے گناہ پر شرمسار ہوں میں

زمانہ آشوب آندھیوں نے مرے دیوں سے لَویں نہ چھینیں
زمیں شکن زلزلوں کے باوصف آج تک استوار ہوں میں
وہ گوہرِ تابدار ہوں جو قبائے یزدانیت سے ٹوٹا
جو قلبِ ربّانیت سے پھوٹا وہ نغمۂ خوش گوار ہوں میں"

کچھ ایسے انسانیت نے رہبانیت کی آنکھوں سے خواب چھینے
کہ جیسے ساون کی بدلیوں سے نچوڑلی ہو نمی کسی نے
یہ جسمِ گردو غبار اُڑاتا ہُوا لپک کر قریب آیا
تو یک بیک خاتمِ تصوّف سے جھڑ گئے خوش نما نگینے
لبوں کے گوشوں سے خون رِس کر تمام زخموں میں رچ رہا تھا
چھلک رہے تھے نہ جانے کیسے نشے سے آنکھوں کے آبگینے
چمک اُٹھا پیکرِ دریدہ میں یوں جھکی ہڈیوں کا ڈھانچا
کہ چادرِ آب میں جھلکتے ہیں جیسے ڈوبے ہُوے سفینے
گلاب کا پھُول جیسے طوفاں کی زد میں آکر بکھر گیا ہو
کچھ اس طرح منتشر تھے انسان کی طہارت کے سب قرینے

تضاد کے پھیر میں الجھ کر ادا اس رہبانیت پکاری
"سمجھ میں آج آ رہی ہے انسان کی جبلّت کی بے قراری
نہیں نہیں، میں فراز کے ہولناک کھڑے سے باز آئی
ازل سے آباد ہیں جہاں خود شناس انسان کے شکاری
نجوم ذرّات کے مقابل نہ آ سکے ہیں، نہ آ سکیں گے
کبھی مسلّم نہ ہو سکے گی مرے عقیدوں کی شہریاری
حقیقتیں دُھل دُھلا کے نکلیں گی علم و منطق کی تیرگی سے
عظیم انساں! ترے لہو کے اگر رہے آبشار جاری
نہ زندگی سے فرار اچھا، نہ موت کا انتظار اچھا
سوائے انسان کے لہو کے تمام قدریں ہیں اعتباری"

۱۹۴۸ء

آزادی کے بعد

کتنے خاکے مری امنگوں کے
پیچ کھاتے ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح چرخ کے تمام نجوم
یک بیک اُڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جن کی حدّت سے تپ رہے ہیں چمن
بُن رہے ہیں گلے سڑے پتّے
کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

روٹیاں بوٹیوں سے تُلتی ہیں
عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پلٹ کے تکتی ہے
اپنے بچپن کے رہگزاروں کو
جیسے معزول شہریار تکیں
اپنی عظمت کی یادگاروں کو

زندگی، عزمِ زندگی سے تہی ‏‏‏ کارواں کے غبار میں گُم ہے
زاہدِ کہنہ سال کی مانند ‏‏‏ مقبروں کے شمار میں گُم ہے

ایک آفاق گیر سنّاٹا ‏‏‏ زندگی! زندگی! پکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے، اپنے ہونٹوں سے ‏‏‏ خون کی پیپڑیاں اُتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم
کب مقدّر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں، یہ خلا کی رقّاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

۱۹۴۸ء

رات بیکراں تو نہیں

نجوم سب بجھتے رہیں، تیرگی اُمڈتی رہے
مگر یقینِ سحر ہے جنھیں — اُداس نہیں

اُفق دھڑک تو رہا ہے، سجھائی دے کہ نہ دے
شفق اُبل تو رہی ہے، دکھائی دے کہ نہ دے
گلوں پہ اوس شعاعوں کے انتظار میں ہے
کہ اس کے حسن کی عظمت کرن کے پیار میں ہے
وہ ایک اور ستارہ لرز کے ٹوٹ گیا

بجا کہ رات بھیانک ہے، بیکراں تو نہیں
عظیم وقت کی رفتار رائگاں تو نہیں

سنا ہے دو قدم آگے مہک رہے ہیں چمن
اسی لیے تو ہواؤں میں ہے لطیف چبھن
اسی لیے تو اندھیرے میں پڑ رہی ہے شکن

اسی لیے تو قدم تیز تیز اٹھتے ہیں
طلسمِ شب کا یہی توڑ ہے، قدم نہ رکیں
اندھیرا ٹوٹ کے برسے مگر یہ سر نہ جھکیں
نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امڈتی رہے
سحر کا توڑ کسی ذی نفس کے پاس نہیں

۱۹۴۹ء

جبر و اختیار

ایک موہوم ثقافت کے علمبردار ہو
ایک بے رحم صداقت کا گنہگار ہوں میں
ایک خوابیدہ مشیّت کے پرستار ہو تم
ایک تابندہ حقیقت کا خریدار ہوں میں
ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر کی جھنکار ہو تم
ایک سونتی ہوئی شمشیرِ جگردار ہوں میں
تم نے افراد سے پیمانِ محبت باندھا
آدمیّت کے تقاضوں کا وفادار ہوں میں
چمن افروزیٔ شبنم سے مجھے کیا لینا
حدّتِ مہر سے جلتا ہوا گلزار ہوں میں

میں اگر بھوک کی شدّت کا گِلہ کرتا ہوں
تم عقیدوں کے غبارے مجھے لا دیتے ہو
میرے ملبوس کے پُر ہول شگافوں کے عوض
کتنی تقدیس سے فرمانِ حیا دیتے ہو
شررِ سنگ ہے کب سے مری بستی کا چراغ
تم تجلّی کو بلندی پہ لُٹا دیتے ہو
ریشۂ گُل میں لہو دوڑ رہا ہو، تو مجھے
پھول کا نام بدلنے پہ سزا دیتے ہو
چونک اٹھتی ہے مری چاپ سے جب ظلمتِ شب
تم ستاروں کو ستاروں سے بھڑا دیتے ہو

تم کو اس وقت بھی معلوم نہیں ہے شاید
کہ زمانہ تو بہت دور نکل آیا ہے
آج سلجھائے گی جمہور کی آواز اُسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو اُلجھایا ہے

اب مرا ذوق کسی قید کا پابند نہیں

تم نے صدیوں مرے وجدان کو ترسایا ہے

نوعِ انساں کے نئے عزم کی تکریم کرو

جب کہ ذرّہ بھی قیامت کی خبر لایا ہے

تم ہی کہہ دو کہ سمندر ہے کف آلود سا کیوں

کیا چٹانوں سے سفینہ کوئی ٹکرایا ہے؟

سنہ ۱۹۴۹ء

آدمی

شاعروں، راہبوں، صوفیوں نے کہا، "اے تشبیہوں کے کیڑو! خدا دُور ہے
آدمی کا خدا تک پہنچنا غلط، آدمی کا تصوّر بھی مجبُور ہے"

میں نے پھولوں سے، شبنم سے، تاروں سے پوچھا، تو سب جھینپ کر مسکرانے لگے
میں تو سمجھا تھا اخفائے حق صرف "خلّاق دانشوروں" ہی کا دستور ہے

میں نے احساس کے ان گنت تار چھیڑے، مگر کوئی نغمہ نہ پیدا ہُوا
یعنی انسان کا وجدان بھی اس الوہی تصوّر کی ہیبت سے مسحُور ہے

آخرِ کار جب آدمیت سے پوچھا تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا
آدمی کا خدا تک پہنچنا غلط — آدمی سے ابھی آدمی دور ہے

آدمی، آدمی کو سمجھنے لگا تو خدا خود زمیں پر اُتر آئے گا
آدمی کا خدا تک پہنچنا تو کیا، آدمی تو خدائی پہ چھا جائے گا

۱۹۴۹ء

نقّاد و

میں تم سے دُور نہیں تیز و تند نقّادو!
خود اپنے ذہن کے دیکھو تو چور دروازے
تمہارے دل مرے نغموں کی گونج سے لبریز
مگر انہی کی نفی ہیں تمہارے اندازے

ذرا قریب سے دیکھو تو پھیکا پھیکا ہے
رُخِ حبیب کا نکھرا ہُوا سلونا پن
جو فصلِ گُل کی لگن میں سُلگ کے راکھ ہوئے
بُلا رہے ہیں تمھیں وہ خزاں نصیب چمن

وہ نرم نرم اجالوں میں گُھلتی گُھلتی شفق
وہ آفتاب کی آہٹ سے جاگتے ہوئے خواب
قدم قدم پہ بپا ایک حشرِ نغمہ و رنگ
وہ چوڑیوں کے چھناکے، وہ عارضوں کے گلاب

یہ کیفیت مجھے محبوب تھی، مگر اک روز
حجابِ رنگ اُٹھا کہ شعور چیخ اُٹھا
وہ "آدمی" جو مرے فن میں سر بزانو تھا
نقاب اُتار کے نزدیک و دور چیخ اُٹھا

یہی وہ موڑ تھا جس پر مری حمیّت نے
قدم بڑھائے تو نقّاد ساتھ دے نہ سکے
جو میرے فن کے گلستاں سے پھول چنتے رہے
ببول سامنے پائی تو لطف لے نہ سکے

الم رُبا ہے ستاروں کی نرم نرم پھبن
مگر وہ اشک، جو ڈھلکیں تو پھر کبھی نہ رُکیں!
نظر فروز سہی یہ صنوبروں کی قطار
مگر وہ لوگ، جو اُبھریں تو پھر کبھی نہ جھکیں!

میں آسمان کی نیلاہٹوں میں گھل جاؤں
مگر زمین کی زلفیں سنوار لوں تو چلوں
فرازِ نجمِ سحر پر سہی مقام مرا
مگر نشیب کی قسمت نکھار لوں تو چلوں

مجھے بھی حسن و محبّت کے گیت یاد تو ہیں
مگر حیات فقط نغمہ و سرور نہیں
میں گلشنوں میں، دلوں میں، دلوں میں بستا ہوں
ذرا قریب سے دیکھو، میں تم سے دور نہیں

۱۹۴۹ء

پرانی جھنکار

جام کھنکے ہیں کہ زنجیر میں جھنکار ہوئی
جام لینا۔ کہ یہ جھنکار تو مانوس سی ہے
زندگی آئی تو ہے غازہ بہ رُخ، زلف بدوش
لیکن انداز یہ کہتے ہیں کہ مایوس سی ہے

افق اب تک شفق آلود نظر آتا ہے
دوستو! یہ کہیں گردِ رہِ خورشید نہ ہو
جو ستارہ ابھی نکلا ہے، ابھی ٹوٹا ہے
میرے ڈھلکے ہوئے آنسو ہی کی تائید نہ ہو

یہ جو زنجیر کی جھنکار سنی تھی ہم نے
اسی جھنکار سے مسحور رہے تھے اجداد اپنے
اپنی تاریخ یہی تھی، یہی ماضی اپنا
اسی چھن چھن سے گھروندے رہے آباد اپنے

دائرے راہ میں منزل نہیں آنے دیتے
دائروں سے فقط اطفال بہل سکتے ہیں
دائروں کا ہے یہ ادنیٰ سا تمسخر ورنہ
پاؤں کیوں توڑ کے بیٹھے ہیں جو چل سکتے ہیں

پھر پلٹ کر اسی منزل کی طرف کیوں جائیں
جس میں زنجیر کی جھنکار سنائی دی تھی
جام اک بار ہی کھنکے، مگر اُس وقت مجھے
وہی جھنکار کئی بار سنائی دی تھی

یہ کرّے کوس جو تا حدِّ نظر پھیلے ہیں
اک تصوّر سے فقط طے نہیں ہونے پاتے
شاخِ انگور پہ اُمڈے ہُوئے لرزاں خوشے
آپ ہی آپ کبھی مے نہیں ہونے پاتے

دوستو! رختِ سفر باندھ کے لپکو، کہ یہاں
جو پڑاؤ کے لیے رُکتے ہیں، رک جاتے ہیں
نخل جو دھوپ سے بچ کر کوئی سایہ ڈھونڈیں
خوب اُبھرنے نہیں پاتے ہیں، کہ جھک جاتے ہیں

نومبر ۱۹۵۰ء

طیورِ آوارہ

خورشید کی شعاعوں میں اک لرزشِ خفی
کہتی ہے — سیلِ نور ہمارے جلو میں ہے

شبنم یہ کہہ کے صحنِ گلستاں سے اُڑ گئی
میں کیسے مختتم سکوں کہ ہر اک چیز رَو میں ہے

بھڑکے تو کائنات کے گوشے چمک اُٹھیں
وہ خواب جو چراغِ حقیقت کی لَو میں ہے

وجدان کی اُڑان ہیں اب تک نہ مل سکی
وہ تابشِ حیات جو اک مشتِ جَو میں ہے

جینے میں اک تڑپ ہو تو مرنے میں اک وقار
انسان کا نکھار اسی رقصِ نَو میں ہے

۱۹۵۰ء

درانتی

چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
خمیدہ ہل کی یہ الھڑ، جوان نورِ نظر
سنہری فصل میں جس وقت غوطہ زن ہوگی
تو ایک گیت چھڑے گا مسلسل اور دراز
ندیم ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوئے گئے آفتاب کاٹے گئے

ہم آفتاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
تو ایک روز عظیم انقلاب کاٹیں گے
ہم انقلاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
زمیں پہ خلدِ بریں کا جواب کاٹیں گے

کوئی بتائے زمیں کے اجارہ داروں کو
بُلا رہے ہیں جو گزری ہوئی بہاروں کو
کہ آج بھی تو اسی شانِ بے نیازی سے
چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
سنہری فصل تک اس کی چمک نہیں موقوف
کہ اب نظامِ کہن بھی اسی کی زد میں ہے
خمیدہ ہل کی یہ اللّھڑ جوان نورِ نظر
جب اس نظام میں لہرا کے غوطہ زن ہوگی
تو ایک گیت چھڑے گا ۔ مسلسل اور دراز

ندیمؔ! ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوئے گئے، آفتاب کاٹے گئے

اگست ۱۹۵۰ء

سفر جاری رہے

کنارِ آبِ رواں شبنمی شگوفوں میں
جہانِ رنگ شعاعوں کے انتظار میں ہے
ندی کی نرم روی میں نجوم اونگھتے ہیں
اداس چاند نہاں نور کے غبار میں ہے
سحر کا ہے یہ تقاضا کہ آفتاب ابھرے
یہ جگنوؤں کا اک انبوہ کس شمار میں ہے

یہیں رکیں کہ چلیں، کچھ بڑھیں کہ سستا لیں
تھپک رہی ہیں ہوائیں، افق بلاتا ہے
سحر تو آئے گی، آتی رہے گی دم لے لیں
دلوں میں کوئی مگر چٹکیاں بجاتا ہے
فضائے شب تو بہت خوابناک ہے لیکن
افق خود اٹھ کے بھلا کس کے پاس آتا ہے

وہ ایک پل جو تجلّی سے ہم کنار ہُوا
ہماری تیز روی کا ہے ایک اجرِ عظیم
یہاں خرامِ ہوائیں رواں ہیں سنّاٹے
وہاں افق پہ مگر گیت گا رہی ہے نسیم
وہ صبح طنز ہے اپنی شکستہ پائی پر
گرے جو پیرہنِ وقت سے ڈھلک کے ندیم

۱۹۵۰ء

موضوع

فن بڑی چیز ہے، تخلیق بڑی نعمت ہے
حسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست

ہے مرے مدِ نظر آج بھی تخلیقِ جمال
گیسوئے شب میں اُلجھتے ہوئے تاروں کے خیال
وہ جوانی کے گلابوں سے مہکتے ہوئے جسم
پھیلتی باہوں میں مدہوش، لپکتے ہوئے جسم
کنجِ گلشن کی خموشی میں امنگوں کے ہجوم
صندلی رُخ پہ بدلتے ہوئے رنگوں کے ہجوم
پیار کی پیاس میں کھلتے ہوئے ہونٹوں کی پکار
آنکھوں آنکھوں میں لگن کا مترنم اظہار

فن کی تعمیر ہوئی ہے انہی ایوانوں میں
یہی مقبول تھے ماضی کے غزل خوانوں میں
انہی کلیوں سے کھلائے گئے گلزار اب تک
انہی شمعوں سے اجالے گئے دربار اب تک
انہی جھونکوں سے روایات میں باقی ہے حیات
منعکس ہے انہی آئینوں میں انساں کا ثبات

میں اگر ان سے الگ بات کروں تو دراصل
یہ فقط گردشِ ایام نہیں ہے اے دوست
حسن بیٹھا ہے سرِ راہ بھکاری بن کر
میرا اندازِ نظر خام نہیں ہے اے دوست
چند اڑتے ہوئے لمحوں کی جبیں عکاسی
میرے فن کا تو یہ انجام نہیں ہے اے دوست
پہلے میں ماہیتِ حسن تو پالوں، — ورنہ
حسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست

جن کی تخلیق سے ہے حسن کی قدروں میں دوام
ان کے ہاتھوں کی خراشیں تو مٹا لوں پہلے

جن کی محنت سے عبارت ہے جمالِ عالم
ان کو آئینہ دکھانا بھی تو فن کاری ہے
ان کی آنکھوں میں جو شعلہ سا لرز اُٹھتا ہے
اس کا احساس دلانا بھی تو فن کاری ہے
اہلِ ثروت نے عقابوں کا بھرا ہے بہروپ
بھولی چڑیوں کو جگانا بھی تو فن کاری ہے
کھیت آباد ہیں، دیہات ہیں اجڑے اجڑے
اس تفاوت کو مٹانا بھی تو فن کاری ہے

لب و رخسار کو موضوعِ سخن ٹھہرا لوں
لیکن اس رنگ کا ماحول تو پالوں پہلے
گن تو سکتا ہوں میں پیچ و خمِ کاکل لیکن
ذہن سے بارِ سلاسل تو ہٹا لوں پہلے
جن کی تخلیق سے فن کار سبق لیتا ہے
ان کے ہاتھوں کی خراشیں تو مٹا لوں پہلے

۱۹۵۰ء

اِنسان عظیم ہے!

اس نے تجھے عرش سے بُلایا
انسان عظیم ہے خدایا!

تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا — تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر — پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں

وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خدایا!

تو نور ہی نور بُن رہا تھا — وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم — لیکن تجھے دل سے مانتا تھا

اب چھونے لگا ہے تیرا سایہ
انسان عظیم ہے خدایا!

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے تو آگ ہے اور وہ اُجالا
تو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ تو دشت ہے، وہ چراغِ لالہ
اس نے ہی تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا

تُو عینِ حیات ہے، مگر وہ تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا

تُو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تُو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا!

اگست ـ ۱۹۵۰ء

جرسِ کارواں

جرسِ کارواں کی موسیقی — کارواں کے خرام کی غماز
جرسِ کارواں کی خاموشی — کارواں کے قیام کی غماز
جرسِ کارواں کی نالہ زنی — سفرِ ناتمام کی غماز

نہ ترنم ملا، نہ سناٹا — نہ مقدر میں نالۂ شب تھا
چند قزاق جا رہے تھے کہیں — ہمصفیرو! یہ کارواں کب تھا
دل میں بوسیدہ لاش کی سی بساند — لب پہ گو احترامِ مذہب تھا
"زندگی! زندگی!" پکارتے تھے — مردہ خوری قدیم مشرب تھا
ان کی آنکھوں میں پیاس جلتی تھی — ہم کو جس پہ گمانِ کوکب تھا

جرسِ کارواں کی دھن کیسی — کارواں کا سراغ بھی تو ملے
جس کی خوشبو نشانِ منزل ہے — آرزوؤں کا وہ چمن تو کھلے

خامشی اک طویل سوچ میں ہے — اترے آتے ہیں برف کے گالے
چار سُو ٹوٹتے ہُوئے تارے — ہر طرف عنکبوت کے جالے

ناگہاں خامشی میں لہر اُٹھی — نیند میں جیسے کوئی کچھ گا لے
جیسے اُمڈی ہُوئی گھٹا میں ہلال — جیسے صحرا کی گود میں لالے

جرسِ کارواں کے منتظرو! — چاپ قدموں کی سن سکو تو سنو
یہ کروڑوں نقوشِ پا، یہ گلاب — اپنی نظروں سے چُن سکو تو چنو

کارخانوں میں ہونکتا فولاد — جوشِ تخلیق میں ہے شعلہ فشاں
کھیت، کانیں، کٹے ہُوئے کہسار — ہاں یہی تو ہیں کارواں کے نشاں
وہ اسی راستے سے گزرے ہیں — جن کی جانب ہے اک جہاں نگراں
ان کے دم سے زمیں کا ذوقِ نمو — ان کے دم سے حیات زمزمہ خواں
ان کی تخلیق محورِ تہذیب — ان کی محنت سے زندگی آساں
ان کا ماضی ہے ظلمت آلودہ — اور مستقبل آفتابِ جواں

رہزنوں کا حصار ٹوٹ چکا
اہتمامِ سفر کرو، تو چلیں
خون کی خوفناک دلدل سے
ہمسفیرو، اُبھر چلو، تو چلیں
جرسِ کارواں کے منتظرو
چاپ قدموں کی سُن سکو، تو چلیں

سنہ ۱۹۵۱ء

فنونِ لطیفہ

یہ رقص و نغمہ، یہ شعر و ادب، یہ حکمت و فن
حیات کُش ہیں، نہیں ہیں اگر حیات آموز
فقط فسونِ تصوّر، فقط طلسمِ خیال
یہ آسماں کے ستارے نہیں زمیں افروز
نکل کے دھند سے جو کُہر میں اُتر جائے
اس آفتاب کے طالب نہیں مرے شب و روز

وہی کرن ہے کرن ارتقا کی نظروں میں
جو گھُل کے ریشۂ گل میں نفوذ کر جائے
جو رنگ بن کے سما جائے بند کلیوں میں
جو آگ بن کے رگِ سنگ میں اُتر جائے
جو آبجو پہ گرے عکس بن کے تاروں کا
جو اوس بن کے لبِ آبجُو بکھر جائے

سنٹرل جیل۔ لاہور — جولائی۔ ۱۹۵۱ء

نغمۂ انساں

اس خراب آباد میں مثلِ بہار آئیں گے ہم — بادہ ریز و رنگ بیز و نغمہ بار آئیں گے ہم
کوہساروں سے برنگِ آبشار آئیں گے ہم — اور میدانوں میں بن کر برگ و بار آئیں گے ہم

اوس کے پیکر میں اُتریں گے چمن زاروں پہ ہم
برق کی صورت میں کوندیں گے جہانداروں پہ ہم

یہ عروسِ زندگی کی دلربائی ہم سے ہے — کارگاہِ زیست کی ہنگامہ آئی ہم سے ہے
جذبۂ تخلیق کی انجم رسائی ہم سے ہے — کبریائی ہم سے، شانِ کبریائی ہم سے ہے

ہم نہ ہوں تو اس طرح اُجڑے، خدائی کا سہاگ
جس طرح خرمن میں بجلی، جس طرح جنگل میں آگ

ہم نے دھرتی کے کلیجے میں نمو پیدا کیا — ہم نے مٹّی کے مرکب سے سبُو پیدا کیا
خوشۂ انگور سے ہم نے لہو پیدا کیا — ہم نے بہ ہنگامہ زارِ رنگ و بُو پیدا کیا

گو عناصر چیختے، چِلّاتے، غُرّاتے رہے
ہم ضمیرِ زندگی میں جذب ہو جاتے رہے

ہم نے دھوئی چہرۂ آفاق سے گردِ ملال	پربتوں پر ہم نے ڈالے گھومتی راہوں کے جال
ہم نے صحراؤں کو بخشا سبزہ زاروں کا جمال	ہم نہ ہوتے تو کسے تھی بحر گردی کی مجال

ہم نے ناپیدا کرانی کے کنارے پا لیے
خاک کے ذرّوں کو یوں چھانا۔ ستارے پا لیے

ہے ہجومِ رنگ اپنے جذبۂ یک رنگ میں	جس طرح نغمے دھڑکتے ہیں ضمیرِ چنگ میں
متفق ہیں آشتی میں، متحد ہیں جنگ میں	جنگ کیا ہے؟ آگ دوڑانا ضمیرِ سنگ میں

زندگی میں جوش ہے، جذبات میں آہنگ ہے
چہرۂ گیتی ہمارے پیار سے گل رنگ ہے

ڈسٹرکٹ جیل کیمبل پور	ستمبر ۱۹۵۱ء

بہار اور مہکار

(چند زندانی دوستوں کی یاد میں)

(۱)

اُتر کر شاخِ گل سے دامنِ گلچیں میں آئے ہیں
مگر یہ گل ہیں یا ویرانیٔ گلشن کی تصویریں
یہ شبنم ہے کہ گلچیں نے گلوں پر خون چھڑکا ہے
بجھی آنکھوں میں کانٹے بن گئیں کاجل کی تحریریں
کسی کے بسترِ کمخواب پر لٹ جائیں گی شب کو
عروسِ فصلِ گل کے منتشر خوابوں کی تعبیریں

(۲)

خزاں کا رنگ فق ہے اس حقیقت کے تصوّر سے
بہاریں مٹ کے بھی مہکار کو مرنے نہیں دیتیں
جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے وہیں سے شاخ پھوٹی ہے
نمو کی قوّتیں اس زخم کو بھرنے نہیں دیتیں

یہی تخلیق کا اعجاز ہے، جس کے بھروسے پر
خزاں میں بھی چمن کو سینچنے کی رسم جاری ہے
نئی کلیوں کے اک انبوہ کی تمہیدِ رنگیں ہے
کلی جو شاخِ گل سے دستِ گلچیں نے اُتاری ہے
گلستاں سے نکل کر کاکلوں میں جس نے دم توڑا
حقیقت میں وہ گل آئینۂ فصلِ بہاری ہے

مری ٹوٹی ہوئی کلیو! مرے اُترے ہوئے پھولو!
تمھاری ہی مہک سے ذہنِ انساں تازہ دم ہوگا
کھِلے گا پھول بن کر، لہلہائے گا چمن بن کر
تمھاری یاد میں اشکوں سے جو رخسار نم ہوگا

۱۹۵۲ء

حُسنِ تخلیق

تالاب کی سطح پر گرا اک پتّا
اک پل کو رُکا رہا کہ شاید شاخیں
ٹوٹے ہوئے زیور کے اُٹھانے کو جھکیں

یا پیڑ کے عکس ہی کو رحم آجائے
گہنا ٹوٹے مگر نہ کھونے پائے

میدان کی سمت سے چلا اک جھونکا
تالاب کو گُدگُدا کے اس پار گیا
پتّے کے قدم اُکھڑ گئے، ہار گیا

آبی حلقوں میں جب اُلجھ کر لپکا
آنسو کی طرح اک اور پتّہ ٹپکا

پت جھڑ کا طلسم بھی بالآخر ٹوٹا
ٹوٹے پتّے نگینے بن کر پھوٹے
پتّوں کی عبا پہن کے ننگے بوٹے

تالاب کے آئینے میں یوں لہرائے
جیسے وادی میں بادلوں کے سائے

پتّا پتّا پلٹ پلٹ کر آیا
تجدید کی چھلنی سے پیاپے چھن کر
تخلیق کے حسن کا تسلسل بن کر

لوگ اس کو جو انقلاب کہتے ہیں کہیں
نیرنگیِ ارتقا سے غافل نہ رہیں

۱۹۵۲ء

سمت

شام ہاتھوں میں شعاعوں کے لیے انگارے — دور پربت کے جھروکے میں نظر آتی ہے
ابنِ آدم کو اگر سمت کا احساس نہ ہو — ایک پل کو تو یہ سمجھے کہ سحر آتی ہے

وہی موہوم اُجالا، وہی لالی، وہی کیف — وہی اک گونج میں لپٹا ہُوا سنّاٹا ہے
کون جانے، کوئی ڈوبا ہے کہ اب اُبھرے گا — کس نے آغاز کیا، کس نے سفر کاٹا ہے

شام کے بعد شعاعوں کے بجھے انگارے — رُخِ گیتی پہ اُترنے لگے کاجل بن کر
صبح ہوتی تو تجلّی کا اُمڈتا سیلاب — سنگ و آہن کی فصیلوں سے بھی آتا چھن کر

جھٹپٹا ہے یہ گجردم کا دھندلکا تو نہیں
کورچشمی کا یہ الزام نہ اپنے سر لو
صبح کے جشن کا انجام کہیں رات نہ ہو
تم جو چاہو تو ابھی سمت معیّن کر لو

۱۹۵۲ء

تھپکی

(ایک کسان عورت کا اپنے شوہر سے خطاب)

میرے بالوں میں سرسوں کے تارے
میرے ہاتھوں میں گندم کے خوشے
میری جھولی میں مکی کے دانے
میرے دل میں محبت کے توشے

تند جھونکے مرے ہم سفر ہیں
دھوپ میری سنہری سہیلی
کھیت میرے خیالوں کے آنگن
میں انہی میں پلی، ان میں کھیلی

میری آنکھوں میں تصویر تیری
میرے ہونٹوں پہ تیری کہانی
میری باتوں میں تیرے قصیدے
میرا پیندا ، تیری جوانی

جھٹپٹے تک ابھی ہاتھ تیرے
ہل کی ہتھی سے ہٹنے نہ پائیں
مانگ کی طرح سیدھی سیاریں
ٹیڑھی لیکوں سے کٹنے نہ پائیں

میں یہاں ان چٹانوں پہ بیٹھی
تجھ کو دوہے سناتی رہوں گی
اپنی آواز کی تھپکیوں سے
ہاتھ تیرا بٹاتی رہوں گی

سیپیوں میں کسی جل پری نے
کتنی محنت سے آنسو چھپائے
ان دہکتے ہوئے آنسوؤں سے
ایک ساحر نے موتی بنائے

جب سمندر میں طوفان آیا
سیپیاں ساحلوں کو سدھاریں
کیسا اندھیر ہے، آنسوؤں سے
تاجروں نے دکانیں نکھاریں

میرے پیارے، تری انگلیوں نے
کتنے دانوں سے دھرتی سجائی
اور دانوں کو سکے بنا کر
تیرے مالک نے ڈفلی بجائی

جل پری ہو کہ دہقان میرا
لٹ رہے ہیں، مگر کون جانے
آنسوؤں میں جہنم چھپے ہیں
گولیاں ہیں یہ گندم کے دانے

ہائے میں نے یہ کیا کہہ دیا ہے!
کوئی سنتا نہ ہو میرا دوہا!
آنسوؤں کی کہانی میں کیسے
بچھانے لگا سرخ لوہا!

۱۹۵۲ء

آخری کھنکتا گیت

شاہراہِ ہستی کے   موڑ کتنے بے ڈھب ہیں
اَن گنت عقیدے ہیں   بے شمار مذہب ہیں
اپنی اپنی چالیں ہیں   اپنے اپنے مشرب ہیں

ثبت دیکھتا ہوں میں   پھول پھول پر مہریں
اِس گلاب پر مہریں   اُس ببول پر مہریں
جمتی برف پر مہریں   اُڑتی دھول پر مہریں

میں، کہ ایک شاعر ہوں   پیار میرا مسلک ہے
میرے شعر کی پرواز   جانے کس اُفق تک ہے
میرا عشق بینا ہے   میرا ذوق زیرک ہے

ظلمتوں کی وادی سے — پھول چن کے دم لوں گا
اے بسیط سناٹے — تجھ کو دھن کے دم لوں گا
گیت بن کے دم لوں گا — گیت سن کے دم لوں گا

گیت حسنِ انساں کے — چشمِ سرمہ سا کے گیت
مرمریں ہتھیلی پر — سرخیِ حنا کے گیت
بکھرے بکھرے بالوں میں — کھیلتی ہوا کے گیت

مسکراہٹوں کے گیت — آنسوؤں میں جو جھلکیں
گیت اُن ستاروں کے — عارضوں پہ جو ڈھلکیں
وہ ہلال سے ابرو! — وہ کمان سی پلکیں!

آخری کھنکتا گیت — حسنِ آدمیت کا
آدمی کے سینے میں — آدمی کی چاہت کا
شاخِ دل پہ گُل بن کر — ناچتی محبت کا

سنہ ۱۹۵۲ء

اِنسانیت

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریبِ شہر نہیں

یہی یقین ہے شیرازہ بندِ نسل و نسب
یہی یقین ہے میرا خلوص، میرا وقار
یہی یقین ہے میرا ادب، مرا مذہب
یہی طلسمِ صبا ہے، یہی ورودِ بہار

یہی یقین مرا شعر، میرا حسنِ نظر
یہی یقین محبّت، یہی یقین جمال
اسی یقین سے تارے ہیں میری گردِ سفر
یہی یقین شعور و خرد کا اوجِ کمال

یہی یقین ہے امن و سکون و نغمہ و رنگ
یہی یقین صدائے اذاں، نوائے چنگ

یہی یقین کہ انسان کی جبلّت میں
بایں شکستہ دلی آشتی ہے، قہر نہیں
وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریبِ شہر نہیں

۱۹۵۲ء

اُفق

وہ کوہسار کی چوٹی ہو یا خطِ صحرا
وہ شاخسار کی جھٹکی میں ہو چٹکتی کلی
کہ گلستاں میں بھڑکتی ہوئی چنار کی آگ
سمندروں کے دھندلکے ہوں یا اُبھرتی موج
ہرا ہرا سا جزیرہ ہو یا منارۂ نور
کسی کے کاکلِ عنبر فشاں کی لہریں ہیں
کہ زیرِ دامنِ رنگیں شباب کی محراب
وہ فلسفے کی گھٹا ہو کہ فن کے لالہ و گل
وہ آدمی کی بقا ہو کہ ارتقائے حیات
فقط خیال ہو یا دائمی حقیقت ہو
افق وہی ہے جہاں آسماں زمیں سے ملے

۱۹۵۲ء

گونج

رات کا پُر وقار سنّاٹا
گونجتی ہے صدائے پائے نجوم
اصل میں گونج ہے سکوت کا گیت
اور پھر کس قدر لطیف و بسیط
گونج ہی گونج کبریا کی ذات
گونج ہی گونج ماورائے حیات
یہ حقیقت مگر کسے معلوم!

زندگی گونج کے سوا کیا ہے
ایک انسان دوسرے کا نقیب
پھول کی گونج پھول کی مہکار
اور یہی ہے اثاثۂ گلزار

ایک اک پھول گلستاں کا غرور
ایک اک آدمی جہاں کا غرور
کاش سب کو مری نظر ہو نصیب!

چاند پر شاخِ گل لچکنے لگی
ہولے ہولے چلی عروسِ صبا
زندگی کے ورق اُلٹنے لگے
کتنے پردے نظر سے ہٹنے لگے
نوعِ انساں خدا سے جا کے ملی
ابتدا انتہا سے جا کے ملی
ٹوٹتا ہے فضا کا سنّاٹا!

۱۹۵۲ء

(۲)

من نہ آنم کہ بہ ہر شیوہ دل از دست دہم
لیک با آن نگہِ حوصلہ فرسا چہ کنم

شبلی

قیاس

چودھویں رات کا یہ چاند ہے یا برگِ خزاں دیدہ ہے
تیرے جانے سے دھندلکے ہی دھندلکے ہیں فضا پر طاری
کہیں شیشے ہی نم آلود نہ ہوں کھڑکی کے!

ایک اُنگلی کا نشاں نور کے مینار کی مانند اُگا
وہ روش ہے، وہ سفیدے کا لچکتا سا شجر ہے، وہ رہی پھلواری
کھیل اندازِ نظر کے بھی ہیں کیسے کیسے؟

پھر وہی بات! — وہی دھند کا زنداں، وہی اُجڑی ہوئی رات
کبریائی کے یہ اسرار ہیں یا شوخ عناصر کی نئی عیاری
آخر انسان مشیّت سے کہاں تک اُلجھے!

چاند روشن ہے مگر میری پنہ گاہ میں تاریکی ہے
تو بھی اِس وقت کسی دَور کی نگری میں ہے، میری پیاری!
دیکھ سکتا ہوں فقط تیرے گریزاں سائے!

سوچتا ہوں، مری آنکھیں — مرے آئینے نم آلود نہ ہوں
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں، وہم سے ہوتی ہے کہاں دلداری
کبھی تارے بھی دھواں دھار زمیں پر اُترے!

۱۹۳۶ء

مسافر

اونگھتی راہ پہ شیشم کی خمیدہ شاخیں
جانے کس سوچ میں مبہوت، جھکی آتی ہیں
موج در موج، پُر اسرار گھنی تیرگیاں
سنسنی بن کے خلاؤں میں رچی جاتی ہے

کوئی جگنو! کوئی تارا! کوئی کرنوں کی رمق!
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں، حشر کی تمہید ہے رات
ساتھیو! ابر دِیا اور میں سمٹنے بھونرو
کچھ کہو، کچھ تو کہو، کوئی کہانی، کوئی بات

دُور موٹر نے سلگتی ہُوئی آنکھیں کھولیں
چاک در چاک شبِ تار کا پیراہن ہے
میرے پیکر سے اُچٹ کر مرا سایہ رینگا
فقط اک دل ہی نہیں، ایک جہاں روشن ہے

روشنی ایک اُمڈتا ہُوا سیلاب بنی
سَن سے آئینۂ احساس پہ کوندے لپکے
ڈولتی رہ گئیں شبنم کی لچکتی شاخیں
جس طرح نیند میں ڈر کر کوئی آنکھیں جھپکے

دگنی شدت سے خلاؤں میں گھلی تاریکی
دل میں امید کا مبہم سا نشاں بھی نہ رہا
ساتھ چھوڑا تھا مرا جس نے تجلّی میں کبھی
وہ سہارا مری قسمت سے یہاں بھی نہ رہا

سنہ ۱۹۳۶ء

تیرگی کلبۂ دہقاں کی رہی مدِ نظر
حجلۂ شاہ کا فانوس نہ ہونا آیا

میری منزل کو اُفق پار بتانے والے
میں نے دیکھا ہے افق تا بہ افق کوئی نہیں
ایک مرکز ہو تو جچتا ہے تجسس، لیکن
اَن گنت دائروں میں گھومتی رہتی ہے زمیں
ہر افق پر اِفقِ نو کی صدا آتی ہے
تیری منزل ہے بہت دور کہیں، اور کہیں

اب مسافر کو نئے عزمِ سفر سے کیا کام
اب اسی بزم پہ پرچم مرا لہرائے گا
اس بیاباں میں چمن زار سجانے کے لیے
میرا احساس مرا آئنہ بن جائے گا
اتنے طوفان اُٹھاؤں گا، کہ ناریخوں میں
اپنے تابوت سے دہقان نکل آئے گا

منجمد کہر کو چٹخائے گی سورج کی کرن
ان دھندلکوں کے کلیجے میں اُتر جائے گی
سائے سمٹیں گے کہ ظلمت پہ کوئی آنچ نہ آئے
تیرگی چاہے گی، لیکن نہ اماں پائے گی
سینۂ سنگ کی حدّت سے کھلیں گے گلزار
اتنی شدّت سے زمانے میں بہار آئے گی

۱۹۴۸ء

جشنِ چراغاں

کس لیے آج کی شب جشنِ چراغاں نہ کروں
دیس کی جنّتِ ویراں کو فروزاں نہ کروں
شپّرۂ چشم نہیں ہوں، کہ ڈروں نور سے میں
چل کے آیا ہوں چراغاں کے لیے دُور سے میں
تیرگی بھاگ رہی ہے مرے آگے آگے
کتنے تارے مرے قدموں کی دھمک سے جاگے
کتنے گلشن مرے نغموں میں نہا کر مہکے
کتنے بھوبھل مری آہوں کی تپش سے دہکے
کتنی آنکھوں میں جلائے ہیں ارادوں کے چراغ
کتنے ہونٹوں سے لگائے ہیں امیدوں کے ایاغ
کتنے دُکھتے ہوئے قدموں کو شفا بخشی ہے
کتنی بے جان امنگوں کو بقا بخشی ہے

ایک دنیا کو میں دھوکا تو نہیں دے سکتا
قمقمے عاریتہً میں تو نہیں لے سکتا
مجھ کو اپنے ہی چراغوں کو جلانا ہوگا
اِک نیا عرش منڈیروں پہ سجانا ہوگا

مجھ کو اس دیس کی ایک ایک گلی پیاری ہے
مجھ پہ اس دیس کا احسان بہت بھاری ہے
اس کی آغوش میں پل بڑھ کے جوانی پائی
اسی مکتب سے یہ اعجاز بیانی پائی
اس زمیں پر میں اندھیروں کو نہ جمنے دوں گا
اپنی دیرینہ اُڑانوں کو نہ تھمنے دوں گا
میں تجلّی کا پیامی ہوں ، جلاؤ شمعیں
آج ہر طاق پہ ، ہر گھر میں سجاؤ شمعیں
قمقمے برق کے، مرمر کے دریچوں میں بھلے
ان گھروندوں پہ مرا خون چراغوں میں جلے

۱۴ر اگست ۱۹۴۹ء

ادب و سیاست

اگر لاشوں کے قتلوں کی تجارت ہی سیاست ہے
اگر دستورِ آدم افگنی جزوِ ریاست ہے
اگر افرنگ کی حلقہ بگوشی اب بھی جائز ہے
اگر انسان کی انساں فروشی اب بھی جائز ہے
اگر آزاد رہنے کی تمنّا جرم ہے اب بھی
اگر انصاف کرنے کا تقاضا جرم ہے اب بھی
اگر روٹی طلب کرنا جہالت ہے، بغاوت ہے
توکّل کا عقیدہ ہی اگر محنت کی اُجرت ہے
اگر علم و ادب پر ایک طبقے کا اجارہ ہے
اگر دانشوروں کو فن پہ پابندی گوارا ہے
تو میں ایسی سیاست پر فدا ہونے سے باز آیا
محبّت میری فطرت، آدمیّت میرا سرمایہ

مرے پیشِ نظر رعنائی و امن و جوانی ہے
مرے مدِّ نظر انساں کا حسنِ جاودانی ہے
مشینوں کا دھواں اُجرت نہیں ہے جاں سپاری کی
مرصّع گالیاں قیمت نہیں خدمت گزاری کی
مجھے محنت کشوں کو دہر کا آقا بنانا ہے
مجھے تخلیق کو خالق کے پہلو میں بٹھانا ہے
مجھے ماؤں کو فقر و فاقہ سے آزاد کرنا ہے
مجھے بچّوں کے چہروں میں گلابی رنگ بھرنا ہے
محبّت چاہیے مجھ کو، صباحت چاہیے مجھ کو
بغاوت ہے اگر یہ، تو بغاوت چاہیے مجھ کو
یہی میرا ادب ہے، اور یہی میری سیاست ہے
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے
مرے جمہور، جن کے خون سے ایوان سجتے ہیں
انہی کی چاپ سے اب آمروں کے کان بجتے ہیں
وہ اُٹھے قافلہ در قافلہ پورب سے پچھم سے
وہ لپکے کارواں در کارواں اقصائے عالم سے

ٹیلوں سے، مرغزاروں سے، بنوں سے، کوہساروں سے

دکانوں سے، گھروں سے، علم و دانش کے اداروں سے

خلش ان کے دلوں میں، اجتہاد ان کی نگاہوں میں

بچھی جاتی ہیں جمہوری روایات ان کی راہوں میں

مرا فن ان کی عظمت کا جب استقبال کرتا ہے

تو استحصال مجھ پر کفر کا الزام دھرتا ہے

اگر یہ کفر ہے، اس کفر کو ایماں بناؤں گا

گجر دم ظلمتِ شب کے ترانے میں نہ گاؤں گا

سنہ ۱۹۵۰ء

ترقّی پسند مصنّفین

غبارِ راہ سہی ہم نشانِ راہ بھی ہیں
جہاں گزیدہ بھی ہیں اور جہاں پناہ بھی ہیں
یہ سب درست کہ معتوب بھی، تباہ بھی ہیں
شبِ سیاہ جہاں میں نویدِ ماہ بھی ہیں
عوام دوست ہیں، یعنی گناہ گار ہیں ہم
مؤرخوں سے مگر اس کے داد خواہ بھی ہیں
لبوں پہ گیت تو ہاتھوں میں ہے عنانِ حیات
کہ ہم تمدّن و تہذیب کی سپاہ بھی ہیں
نجومیوں نے چمک سے فریب کھایا ہے
خلا میں چند ستارے ابھی سیاہ بھی ہیں
یہ انقلاب کی ہے اوّلیں جھلک، کہ ندیم
ہماری کھوج میں شاہانِ کج کلاہ بھی ہیں

زنداں

پسِ دیوار ہے اک اور بھی دیوارِ بلند
ایک دیوار کے پیچھے کئی دیواریں ہیں
یہ احاطوں میں احاطے، یہ فصیلیں، یہ حصار
وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

حبس تاریخ کی اک طرفہ روایت تو نہیں
یہ تو ہے عظمتِ آدم کا طرازِ عنواں
ایک تغئیر کی تمہید ہے زنداں گردی
انہی ظلمات سے ہوتا ہے طلوعِ انساں

ارتقا کا یہ چلن ہے کہ ہر انجام سے قبل
نئے آغاز کے رستے میں اُبھرتی ہے فصیل
انقلابات کی یلغار میں دب جاتی ہے
سطوتِ کوہِ ہمالہ ہو کہ طغیانیِ نیل

آج زنداں میں سہی، دست بہ زنجیر سہی
کل یہ میدان میں شمشیر بدست ابھریں گے
جس طرح تیر کمانوں سے نکل جاتے ہیں
یوں بیک جست فصیلوں سے یہ مست ابھریں گے

دوستو ایک چھلاوے کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ جو اٹھتی ہوئی، تنتی ہوئی دیواریں ہیں
حرّیت کی یہ اسیری ، یہ تشدّد کا فروغ
وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

سنٹرل جیل - لاہور سنہ ۱۹۵۱ء

صحافیوں کے نام

ہم قدم دوستو، ہم قلم ساتھیو، ہم سفر ہیں تمھارے ہم اہلِ قلم
حشر تک ذہن کی وسعتوں میں یونہی پھڑپھڑاتے رہو زندگی کا عَلم

دوستو، تم وہی ہو کہ جن کے قلم کے اشارے پہ رقصاں ہے تاجِ تہی
ساتھیو، تم وہی ہو کہ ہیبت سے جن کی سرِ آمریت بھی رہتا ہے خم

ہم صفیرو، ہماری نظر میں بھی ہیں وہ گھروندے جو اُجڑے تو اُجڑے رہے
ہم جلیسو، ہمارے بھی دل خون ہیں، ہم نصیبو، ہماری بھی آنکھیں ہیں نم

ہم نے بھی فصلِ گل میں سرِ شاخ کتنے گلُوں کے جنازوں کا ماتم کیا
ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گلشن میں مالی بہت! ویرانی ہے کم

تم ہو، یا ہم ہوں، یہ بات ہے مشترک، ہم کریں گے نہ ایماں کی سوداگری
بحر میں چاند بے شک نہاتا رہے، چاندنی تو نہ ہوگی سمندر میں ضم

تم نے خبریں لکھیں، ہم نے نظمیں کہیں، تم نے کلیاں چنیں، ہم نے گجرے بُنے
در حقیقت تمھارے ہمارے قلم کر رہے ہیں تواریخِ عالم رقم

ایک مقصد ہے جب، ایک منزل ہے جب، کیوں نہ مل کر بہم ہم قدم دوستو
یوں اُٹھیں جیسے مشرق سے خورشید اور یوں چلیں، جنگ میں جیسے تیغِ دودم

آؤ انسان کی زندگی کو نکھاریں کہ انسانیت کو سہارا ملے
آج کل زندگی اک ستم ہی تو ہے، اس پہ انسان کی بندگی کا ستم!

باوجودیکہ تم سب دل افگار ہو، تم صداقت کے آئینہ بردار ہو
تم نے تولا ہے قانون کو عدل میں، تم نے کھولا ہے ظلِ الٰہی کا بھرم

ہم کو سرمایہ داروں سے کیا واسطہ! آخر آگ اور پانی کا رشتہ ہی کیا
اہلِ دولت ہیں وہ، اہلِ دانش ہیں ہم، ان کو خود اپنا غم، ہم کو دنیا کا غم

اب قلم کا بھرم سخت دشوار ہے، دہر کو خود فریبی کا آزار ہے
سنگ سے تو تراشے ہی جاتے ہیں بُت، اب عقیدوں میں بھی ڈھل رہے ہیں صنم

جو کہو حق کہو، جو لکھو حق لکھو، مشعلِ آدمیّت کو بجھنے نہ دو!
اپنے جس ہاتھ میں تھامتے ہو قلم، تم کو اس ہاتھ کی آبرو کی قسم!

۱۹۵۲ء

غمِ وطن

میرا غم، صرف مرا غم تو نہیں، کم کیوں ہو
آدم اس دور میں بھی کشتۂ آدم کیوں ہو

آدمیت ہی جب اس دور میں پامال ہوئی
اپنی اک ذات کے لٹنے کا مجھے غم کیوں ہو

جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی
وہی سفاک مرے دیس کا ہمدم کیوں ہو

جب لنڈھانے پہ بھی بچتا ہی رہا بادۂ ناب
پھر مرے جامِ سفالیں میں بھرا سم کیوں ہو

اس کے سائے میں جب انسان کو دم لینا ہے
خونِ انساں ہی میں ڈوبا ہوا پرچم کیوں ہو

جس کے کانوں نے صدائیں جرسِ گل کی سنیں
اس کے ہونٹوں پہ فقط نوحہ و ماتم کیوں ہو

گود میں جس کی پلے وارث و خوشحال و لطیف
اس کے بشرے پہ بھلا یاس کا عالم کیوں ہو

کٹ کے بھی جھک نہ سکا جو سرِ پندارِ وطن
کسی سلطان کے دربار میں اب خم کیوں ہو

جب گلوں تک کو خبر ہے کہ بہار آتی ہے
گلشنِ غیر سے دریوزۂ شبنم کیوں ہو

سینۂ شب میں دھڑکتا ہے دلِ صبحِ جمال
لب ترے خشک ہوں کیوں آنکھ تری نم کیوں ہو

مجھ کو ڈر ہے، تری آواز ہے بھرّائی ہوئی
حرّیت کا یہ ترانہ ہے تو مدھم کیوں ہو

جس کو تہذیب و تمدن کا افق چھونا ہے
چند فرسنگ کی پرواز سے بے دم کیوں ہو

پیٹھ کا زخم نہیں ہے کہ ندامت ہو تجھے
زخم سینے کا ہے ۔ شرمندۂ مرہم کیوں ہو

۱۹۵۲ء

یہ رات

دلیلِ صبحِ طرب ہی سہی یہ سناٹا
مگر پہاڑ سی یہ رات کٹ چکے تو کہوں
پسِ نقاب ہی پنہاں سہی عروسِ سحر
مگر یہ پردۂ ظلمات ہٹ چکے تو کہوں

یہ رات بھی تو حقیقت ہے تلخ و تند و درشت
اسے سحر کا تصوّر مٹا نہیں سکتا
مجھے تو نیند نہیں آئے گی کہ میرا شعور
شبِ سیاہ سے آنکھیں چرا نہیں سکتا

اگر نشانِ سفر تک کہیں نہیں، نہ سہی
میں رینگ رینگ کے یہ شب نہیں گزاروں گا
شکست سے مرا اخلاق اجنبی ہے ندیمؔ
سحر ملے نہ ملے، رات سے نہ ہاروں گا

۱۹۵۲ء

(۴)

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

(غالب)

عنفوانِ شباب

شبنم آئینہ بدست آئی سرِ برگِ گلاب

ایک معصوم کلی

شاخساروں سے ہمک کر نکلی

آئینہ دیکھ کے شرمائی، لجائی، کانپی

جھرجھری لے کے سنبھلنا چاہا

لیکن احساسِ جمال

ایک کوندا ہے جو لپکے تو لپکتا ہی چلا جاتا ہے

اور معصوم کلی

کپکپاہٹ کے تسلسل سے چٹکنے پہ جو مجبور ہوئی

چُور ہُوئی

غنچہ تخلیق ہُوا

آئینہ چونک اُٹھا

سنہ ۱۹۴۷ء

پنشن

کتنی بوڑھی ہے مرحوم انور کی ماں
جو لٹکتی بھوؤں کو اٹھا کر
نہ جانے افق پر کسے دیکھتی ہے!
افق کی طرف چند ویران پگڈنڈیاں جا رہی ہیں
لچکتی ہوئی، پیچ کھاتی ہوئی
زرد ٹیلوں کی آسیب آلود وحشت بڑھاتی ہوئی
اپنی منزل کو چھونے سے پہلے
چھلاوے کی مانند نظروں سے غائب ہوئی جا رہی ہیں

کچھ تو کہتی ہے مرحوم انور کی ماں
نطق کا کام لیتی ہے ٹھوڑی کی جھلّی کے اقلیدسی زاویوں سے
"کہاں جا رہا ہے؟ کدھر کا ارادہ ہے اے نوجواں؟"
۔"میں تو ان وسعتوں میں گزشتہ زمانے کے آثار چُننے چلا ہوں
کہ تہذیبِ نو کے عجائب گھروں میں
شہنشاہوں کے ادھ کٹے ناخنوں کو بھی
بلّور کے مرتبانوں میں
انسانیت کی امانت سمجھ کر سجاتی ہے دنیا
مگر تو کہاں جا رہی ہے؟"

کتنی بھولی ہے مرحوم انور کی ماں
ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہے مجھے
دیکھتی ہی چلی جا رہی ہے مجھے
جیسے بچّہ ستارے کے مٹتے ہوئے راستے کو تکے
اور تکتا ہی رہ جائے
۔"انور کی ماں، تو کہاں جا رہی ہے؟"

جھرجھری لے کے مرحوم انور کی ماں سوچتی ہے
خدا جانے کیا سوچتی ہے
کہ ٹیڑھی سی لاٹھی کو ٹیڑھے سے ہاتھوں میں تھامے ہوئے
چند صدیوں کے بوسیدہ بُت کی طرح جم گئی ہے
مگر ساتھ ہی اس کی ٹھوڑی کی جھلّی کے اقلیدسی زاویوں میں
نیا زاویہ بن رہا ہے
جو کہتا ہے
"یہ تہذیبِ نو کے عجائب گھروں میں
شہنشاہوں کے ادھ کٹے ناخنوں کے تلے
اک سپاہی کا ڈھانچا بھی ہوگا
جسے میں نے دس ٹکلیوں کے عوض
اب سے چھ سال پہلے
افق کی انہی چند ویران پگڈنڈیوں کے حوالے کیا تھا"

۱۹۴۷ء

مغویہ

رات خاموش ہے

سر برآوردہ اشجار دن بھر کے رقصِ مسلسل سے تھک ہار کر

بازوؤں کو سمیٹے

اندھیرے کے بستر پہ خوابیدہ ہیں

سرد جھونکے خراماں ہیں لیکن کوئی چاپ اُٹھتی نہیں

جیسے شاہی کنیزیں، جو ملبوس کے نقرئی حاشیوں کو سنبھالے ہُوئے

کانچ کے فرش پر چل رہی ہیں

ستاروں کی آنکھوں میں نیندیں ہیں

رفتار میں ایک ایسا بہاؤ ہے

جیسے فضا سے اُترتے ہُوئے برف کے نرم گالے

پراسرار

آواز سے بے نیاز

اوّلیں عشق کی دھیمی سرگوشیوں کی طرح

رات خاموش ہے

جیسے اپنے ہی بالوں میں لپٹی ہوئی سانولی سی دلہن

جس کے ماتھے کی افشاں پہ

گالوں کے غازے پہ

ہاتھوں کی مہندی پہ

سینے کے اُمڈے ہُوئے عزمِ تخلیق پر

اس کے اپنے ہی پیکر کی خوشبو نے

وہ دائرے بُن دیے ہیں

جو چھُونے سے کھُل جائیں گے

رات خاموش ہے

رات کی خامشی کتنی گہری ہے، کس درجہ گمبھیر ہے

کس میں ہمّت ہے جو زور کی سانس تک لے سکے

رات کے اس وقار اور پندار کو ٹھیس پہنچا سکے

کس قدر طنطنے، کتنی پیاری رعونت سے لبریز ہے رات کی خامشی

رات کی خامشی کتنی گہری ہے، کس درجہ گمبھیر ہے

رات خاموش ہے

ایک چیخ آسماں سے زمیں تک خراشیں اُگاتی ہوئی

چار جانب لپکتی چلی جا رہی ہے

ہوا کا بہاؤ اُلجھنے لگا ہے

ستارے لرزنے لگے ہیں

خود اپنے ہی بالوں میں لپٹی ہوئی سانولی سی دلہن

ٹوٹتی نیند کی ڈوریاں اپنی پلکوں سے چنتی ہوئی

چونک اُٹھی ہے

خموشی کی گمبھیرتا کا بھرم کھُل گیا ہے

وقار اور پندار کے آئینوں کی کئی کرچیاں ہر طرف منتشر ہیں

یہ گستاخ آواز کس کی تھی؟

یہ کون تھا؟

رات کی خامشی پھڑپھڑانے لگی ہے

شبوں کے ورق چیختے اور بجتے ہوئے ہر طرف اُڑ رہے ہیں

یہ راتیں، یہ دن

اور یہ شامیں، یہ صبحیں،
گھٹائیں اُمڈتی ہُوئی اور چھٹتی ہُوئی
بجلیاں جل رہی —، بجھ رہی ہیں
کڑک ہے
چمک ہے
ورق اُڑ رہے ہیں
ورق تھم گئے ہیں
سکوت — ایک گمبھیر گہرا سکوت —
اک پُراسرار سنّاٹا
اک بار پھر رات خاموش ہے

رات کی خامشی میں
بہت دُور سے
نیند میں چُور اک آواز آنے لگی ہے
اس آواز میں رات کی خامشی کا شکستہ وقار
ایک ٹوٹا ہُوا طنطنہ

زخم آلود خود اعتمادی

پکار

احتجاج

اور جانے کہاں کا تاثر ہے

آواز آنے لگی:

تم نہیں جانتے

تم جو ناموس و عصمت کی چھاتی میں آزادیوں کے عَلم گاڑتے ہو

مجھے تم نہیں جان سکتے

سیاست کے بازار کی جنس کو کون پہچان پائے

کسے دھیان آئے

کہ میں کون ہوں

قوم کے رہنما

میری تقدیس کو بیچ کر

اک نئی جنگ

اک تازہ سوداگری کے لیے

پھر سے تیاریاں کر رہے ہیں
میں اس شور میں آج کس کو پکاروں
بتاؤں کسے
کس کو آواز دوں
کس سے یہ راز کہہ دوں
کہ میں مذہب و نسل کے چند رنگیں غباروں کے بدلے میں بیچی ہوئی
ایک عورت ہوں
بیٹی ہوں
بیوی ہوں
ماں ہوں
بہن ہوں
میں اک مغویہ ہوں!"

۱۹۴۸ء

فن برائے فن

ابھی تو ڈوب رہی ہے لہو میں راہِ حیات
ابھی حکایتِ عشق و جمال کون سنے
عظیم ادب کے نقیبو!
بڑے ادب کے مریضو!
مجھے بھی یاد ہیں وہ خواب ناک افسانے
جو اس جہاں سے بہت دُور، اک جزیرے پر
پنپ رہے ہیں گھنی چھتریوں کے سائے میں
مگر یہ ٹھوکریں کھاتا ہُوا غریب انساں
تہی شکم ہے، تہی دست ہے، تہی دل ہے
بڑے ادب کے بجائے بڑا سوال یہ ہے
کہ اس کے ہاتھ سے نوچے ہُوے نوالوں کو
کوئی نگل نہ سکے

نگل سکے تو یہ بن جائیں ایسے انگارے
جنھیں اُگل نہ سکے

تمھیں "دوام" سے مطلب، مجھے عوام سے کام
فقط عوام کے دم سے ہے زندگی کو دوام
مگر یہ دَور — یہ اس دَور کے غریب عوام
اناج اُگائیں مگر احتیاج کے ہاتھوں
زباں سلگتی سلاخوں پہ دھر کے مر جائیں
عظیم ادب کے نقیبو! مجھے اجازت دو
کہ میں تمھاری اولوالعزمیوں سے کترا کر
حقیقتوں سے نبرد آزما رہوں، جب تک
عوام کو بھی ہمارا "دوام" راس آئے
ابھی حکایتِ عشق و جمال کون سُنے
ابھی تو ڈوب رہی ہے لہو میں راہِ حیات

۱۹۴۸ء

ارتقا

ہم کہاں سے چلے تھے ؟
کہاں جائیں گے ؟
ہم کہاں جائیں گے ؟
ہم عناصر کے طوفاں میں
تنکوں کی مانند
جانے کہاں سے چلے تھے ؟
کہاں جائیں گے ؟
ہم کہاں جائیں گے ؟

اس قدر یاد ہے
ہم نے چشموں میں جب اپنے پیکر کی عریانیاں دیکھ پائیں
تو مارے ندامت کے بھاگے
گھنی جھاڑیوں میں چھپے

اور گپھاؤں میں دبکے رہے
ایک مدّت کے بعد
اپنی عریانیوں کے تصوّر سے مامون ہو کر اُٹھے
اور لپکتے ہوئے پھر سے چشموں پہ آئے
تو مارے حیا کے سمٹتے ہوئے
ہم نے ملبوترے سبز پتّوں میں اپنے بدن کو چھپایا
افق سے مگر ایک آندھی اُٹھی
جس نے پتّوں کے ملبوس پر تند یلغار کر دی
اپٹتے ہوئے سبز پتّے سنبھالے ہوئے
لڑکھڑاتے ہوئے پھر سے چشموں پہ آئے
تو مارے ندامت کے ہم نے خلاؤں میں ان قوّتوں کو ٹٹولا
جو انسان کو ستر پوشی سے محروم رکھنے کی خواہش میں
اس درجہ سنجیدگی سے
لپکتی جھپٹتی رہیں
کون ہیں وہ ؟
کہاں ہیں ؟

کہاں ہیں ہمارے ارادوں کے قاتل

امنگوں کے دشمن ؟

کہاں ہیں ہمارے شعور و خرد کو کھلونوں کی مانند چکرانے والے؟

تڑپتے ہوئے

بلبلاتے ہوئے

ہم نے دریاؤں سے

کوہساروں سے

نیلے سمندر کے چنگھاڑتے پانیوں سے

ہواؤں سے

مبہم خلاؤں سے

تاروں سے

عرشِ بریں کی بہاروں سے پوچھا

مگر بازگشت اک المناک سنّاٹا بن کر

ہمارے تخیّل پہ مکڑی کے جالے سے بُنتی رہی

اور ہم مدّتوں تک بھٹکتے رہے

سر پہ پُرہول بادل گرجتے رہے

بجلیاں ہر طرف جگمگاتی رہیں
آندھیاں چار سُو پیچ کھاتی رہیں
دندناتی رہیں
دھوپ کتنے الاؤ جلاتی رہی
راستوں پر جہنّم سجاتی رہی
چمچماتی رہی
ہم عناصر کے طوفاں میں
تنکوں کی مانند اُڑتے رہے
اور ٹوٹے ستاروں کو چُنتے رہے
یک زباں ہو کے ہم پوچھتے تھے
ہمارے بھٹکتے ہوئے ہم نصیبو!
کہو
ہم کہاں سے چلے تھے؟
کہاں جائیں گے؟
ہم کہاں جائیں گے؟

اس قدر یاد ہے،
جب ہمارے تجسس نے تھک کر پروں کو سمیٹا
تو یہ ڈر خیالات میں سر سرایا
کہ ہم اتنے بے مایہ ہیں
بے حقیقت ہیں
بے دست و پا ہیں
کہ رُکنے کی کوشش کریں
تو عناصر کی طغیانیاں آ دھمکتی ہیں
اور یوں نچاتی ہیں ہم سب کو
جیسے بھنور میں پھنسی سیپیاں!
جانے وہ کون ہے
جس کے ہاتھوں میں باگیں ہیں مٹی کی
پانی کی
آتش کی
اور اُن ہواؤں کی
جو گنگناتی بھی ہیں

وندنانی بھی ہیں
جانے وہ کون ہے!

اس قدر یاد ہے،
ہم نے اک روز سورج کی آتش فشانی سے ڈر کر
خلوص اور محبت سے سجدہ کیا
اور سورج نے ہنس کر
ہماری عقیدت پہ زریں شعاعوں کے سہرے بکھیرے
مگر جھٹپٹے نے
ہمارے خداوند کو یوں سمیٹا
کہ جیسے ازل سے یہاں تیرگی کی حکومت رہی ہے
معاً چاند روشن ہُوا
چار جانب اُجالے کی نہریں بہاتا ہُوا
مسکراتا ہُوا
اور ہم مات کھائی عقیدت کا تابوت لے کر بڑھے
چاندنی میں نہاتے ہُوئے

گنگناتے ہوئے،

ہم نے سجدے کیے

ہم نے مالاؤں پہ چاند کی عظمتوں کے قصیدے پڑھے

پو پھٹے تک نہ جانے کہاں تک بڑھے تھے

کہ ناگاہ مشرق سے نیزے اُٹھے

اور ہمارے خداوند کے نقرئی فرغلوں میں اُلجھ کر ہٹے

تو نہ وہ نور تھا اور نہ انداز تھے

بس خداوندِ خاور کی مانند

اک مضمحل راز تھے

اس قدر یاد ہے

ہم فنا کے تصوّر سے مبہوت تھے

جو خیالات تھے، غیر مربوط تھے

کون ہیں ہم؟

کہاں سے چلے ہیں؟

کہاں جائیں گے؟

ہم کہاں جائیں گے؟

قافلے کی قیادت بقا چاہتی ہے
مگر ہم فنا کے جزیروں پہ
ان ناریل کے درختوں کی مانند استادہ ہیں
جو گرجتی ہوئی تند آندھی کے ریلے ہیں
جھکتے ہیں، اور ٹوٹ جاتے ہیں
تنہائیوں کے سمندر پہ
کچھ بلبلے
تھرتھراتے ہیں
اور پھوٹ جاتے ہیں
اور کائنات ایک چکر میں بے سُدھ رواں ہے
نہ جانے مسافر کی منزل کہاں ہے!

ہمیں یاد ہے
ہم بھٹکتے بھٹکتے چٹانوں میں آئے
چٹانیں جو روزِ ازل سے
انہی زاویوں پر کھڑی تھیں

جہاں ان کو تخلیق کی قوتوں نے جمایا!

یہی ہے،

ہمارے تصوّر کی منزل یہی ہے

یہیں ہے

ہمارے خیالاتِ وارفتہ قسمت کا معبد یہیں ہے

چٹانوں کے پردوں سے اصنام یوں جھانکتے تھے

کہ جیسے ہمارے تجسّس کی ناکامیوں سے پریشاں بھی ہیں

اور شاداں بھی ہیں

جیسے دو شاخہ تیشوں کی اک چوٹ سے

وہ لپک کر چٹختی چٹانوں سے نکلیں گے

اور جادوانی سکوں کی بہشتوں میں لے جائیں گے

زندگی کے مزے آئیں گے

لیکن اک رات

جب ساری دھرتی تڑپنے لگی

کوہساروں پہ آتش بھڑکنے لگی

اور پگھلی ہوئی موت

لاوے کی صورت میں بہنے لگی
ہم سے کہنے لگی
"اب کہاں ہیں وہ سنگیں خدا؟
مندروں کے دلارے
سہارے تمھارے!
نواسے ہمارے!
بلاؤ انھیں
جاودانی سکوں کی یہ جنت دکھاؤ انھیں!"
تو اچانک ہمارے خداؤں کی لاشوں میں
اک اور بھی لاش دھم سے گری!
وہ سکوں لُٹ گیا
جو ہزاروں برس کی ریاضت سے حاصل کیا تھا

مگر اس قدر یاد ہے
ہم نے "محسوس" سے "غیر محسوس" کی سمت دیکھا
کہ شاید وہ صدیوں کی اس سرمدی خامشی میں

ہمیں اپنے دکھ کا مداوا ملے

کوئی ملجیٰ و ماویٰ ملے

کوئی ایسی حقیقت

جہاں چند لمحے اماں مل سکے

جو یہاں اتنی نایاب ہے

تو وہاں مل سکے

ہم نے مرمر کے محلوں کو بلّور کی مشعلوں سے سجایا

خیالوں کا معبد بنایا

الوہی تجلّی سے مرعوب و مخمور ہو کر اُٹھے

اور انسانیت کے خیاباں میں

ہم گھومتے گنگناتے چلے جا رہے تھے

کہ رستے میں اک آئینہ جھلملایا

لپک کر اُٹھایا

تو روزِ ازل کی طرح اپنے پیکر کو عریاں ہی پایا!

ندامت کے مارے

تمدّن کے غاروں میں

تہذیب کی گھاٹیوں میں
فنونِ لطیفہ کی لہروں میں
چھپتے ہُوئے اور دبکتے ہوُئے
ہم مساوات کے گلشنوں میں جب آئے
اخوّت کے پتّوں سے پیکر کی عریانیوں کو چھپایا
خفیفت کا طوفان لیکن ہمارے تعاقب میں آیا

مگر آج
ہم آخری بار
اپنی پُراسرار دنیا کی اُن قوّتوں سے نمٹنے چلے ہیں
جو روزِ ازل سے
ہمیں ستر پوشی سے محروم رکھنے کی خواہش میں
اس درجہ سنجیدگی سے
لپکتی جھپٹتی رہی ہیں

۱۹۴۸ء

خزاں کے پھول

عین پت جھڑ میں شہنشاہ کا فرمان ملا

"حاجبو! پھول! مہکتے ہوئے، ہنستے ہوئے پھول!

بد ولت کو یقیں ہے کہ خزاں کے باوصف

مملکت کے کسی گوشے میں چمن کھلتے ہیں

آج سلطانۂ عالم کے لبوں کی سُرخی

اتنی گہری ہے کہ دل پر بھی گمانِ گُل ہے

ہم شبستانِ شہی میں نہیں رکھیں گے قدم

بسترِ قاقم و سنجاب ہمیں ڈس لے گا

گو سجایا ہے کنیزانِ حرم نے اس کو

اس کی پھیلی ہوئی باہوں میں ہے دنیا آباد؛
عنبر و عود بھی ہے، بادۂ گل فام بھی ہے
مشک ہے، عطر ہے، شمعیں ہیں، مگر پھول نہیں
پھول لاؤ کہ مہکتے ہوئے پھولوں کے بغیر
ہم شبِ وصل کا اعلان نہیں کر سکتے
اور سلطانۂ عالم کے لبوں کی سرخی
اتنی گہری ہے کہ دل پر بھی گمانِ گل ہے!"

شام کو دھول اڑاتے ہوئے لوگوں کا ہجوم
پھول ہی پھول سمیٹے ہوئے آپہنچا ہے
قصرِ شاہی کے چمکتے ہوئے زینوں پر سے
مسکراتے ہوئے سلطانِ جہاں اترے ہیں
اور صندل کی مہکتی ہوئی چلمن کے ادھر
آج سلطانۂ عالم کے لبوں کی سرخی
اتنی گہری ہے کہ ہر شے پہ گمانِ گل ہے!

گونج اُٹھی چار طرف حاجبِ اعلیٰ کی صدا
،، حاجبو! پھول سمیٹو کہ شہنشاہِ جہاں،
اپنے خدام کو دیدار کی دولت بخشیں!،،

اور پھر ظلِ الٰہی نے یہ ارشاد کیا:
،، بادولت کو خوشی ہے کہ نمک خواروں نے
عین پت جھڑ میں بہاروں کا سماں باندھ دیا
بادولت کو مگر اس پہ تعجب ہے ضرور
اتنے انبار سے مہکار کہاں غائب ہے!،،

یک بیک دھول اُڑاتے ہوئے لوگوں کا ہجوم
یک زباں ہو کے بڑے کرب سے پھنکارتا ہے
،، آسماں جاہ شہنشاہ کا اقبال بلند!
ہم نے تپتے ہوئے صحراؤں کو دن بھر چھانا
ہم نے ٹیلوں کے کلیجوں میں اُتر کر دیکھا

ہم نے جھلسے ہُوئے پربت میں دراڑیں ڈالیں
ہم نے پت جھڑ کو خدا مان کے سجدے بھی کیے
لیکن اک پھُول کی پتّی بھی نہ پائی ہم نے
اور اب جاں کی اماں پائیں تو یہ عرض کریں
شاہِ ذی جاہ کے بھیجے ہُوئے کارندوں نے
عین پت جھڑ میں بہاروں کا سماں باندھ دیا
اور کوڑوں کے تواتر سے جو گُل کھلتے ہیں
رنگ دے سکتے ہیں، مہکار نہیں دے سکتے!"

۱۹۴۹ء

میں تمھارا ہوں

تم کہاں ہو؟

کہاں ہو مرے ساتھیو؟

میں محبت کی ناکامیوں کے دھندلکوں میں لپٹا ہُوا

اس بلندی پہ آکر رُکا ہوں جہاں

زندگی اوس کا ایک موتی ہے

جس کے لیے لمس بھی موت ہے

آگہی پھُول کی ایک نازک سی پتّی ہے

جس کے لیے زندگی بار ہے:

حسن خوشبو کا جھونکا ہے

اُڑتے ہوئے وقت کے بازوؤں سے لپٹتا ہُوا!

عشق پرواز کے روپ میں ایک افتاد ہے!

کائنات اک کھلونا ہے

جو گھومتے گھومتے تھک چکا، تھم چکا ہے!

جدھر دیکھتا ہوں، فضا ہے، خلا ہے
فضا کا سکوتِ مسلسل صدا بن رہا ہے
خلا کا پُر اسرار سنّاٹا بانگِ درا بن رہا ہے
مگر سمت اس کی معیّن نہیں
تم کہاں ہو، کہاں ہو مرے ساتھیو
تم صدا دو، صدا دو مرے ساتھیو
میں اکیلا ہوں
گم کردہ رہ ہوں
بچاؤ مجھے
آج اُس زندگی کے مناظر دکھاؤ مجھے
جس میں مزدور کی ضرب شعلے اُگاتی ہے
پتھر کو سونا بناتی ہے
اور ایک خاموش فریاد بن کر
مؤرخ کی تحریر میں ڈوب جاتی ہے
(اور ارتقا کے دریچے میں نورِ سحر کی طرح جھلملاتی ہے)

آؤ مرے ساتھیو!
مجھ کو کھیتوں میں لے جاؤ
دہقاں جہاں زندگی کاشت کرتے ہیں
چپ چاپ مرتے ہیں
اوراقِ تاریخ پہ دھول بن کر اُترتے ہیں
(ادراکِ انساں کے صحراؤں پہ پھول بن کر اُترتے ہیں)
مجھ کو بچاؤ مرے ساتھیو
مجھ کو زخموں کی دنیا میں لے جاؤ
ننھّے فرشتوں کی لاشوں کے انبار میں
بیٹیوں اور بہنوں کے بازار میں

اُن دیاروں میں
جن کی چمک عارضوں سے نچوڑی گئی
جن میں فرعون و ہامان بستے ہیں
انساں کے بھیس میں چند شیطان بستے ہیں
دانتوں میں انسانیت کا کلیجہ دبائے ہوئے
اپنے چہروں پہ ماحول و مذہب کا غازہ لگائے ہوئے

زندگی جس جگہ اک مسلسل مشقت ہے
اور آگہی ایک کانٹا ہے
جو ہڈیوں میں اُترتا چلا جارہا ہے
مگر ٹوٹتا ہی نہیں!؟

اے مرے ساتھیو
مجھ کو آواز دو
ماورائی دھندلکوں میں لپٹی ہُوئی
ذوق و وجدان کی رفعتوں سے اتارو مجھے
اب لہو اور پسینے کی دنیا میں لاؤ مجھے
اصل میں —
آج اس گھر میں کوئی شے چرمرائی تھی
کچھ اس طرح کی اک آواز آئی تھی
جیسے کوئی آبگینہ چبائے!
مجھے ہر طرف مشعلیں سی نظر آئی تھیں
جن کی لاکھوں دریدہ زبانیں

اندھیرے کو یوں چاٹتی پھر رہی تھیں

کہ جیسے ستاروں کا انبوہ، ناگاہ، یلغار کردے

افق تا افق تیرگی دھجیاں بن کے اڑنے لگی

مشعلوں کے جلو میں کئی قافلے تھے

درانتی درانتی سے ٹکرا رہی تھی

فضا گا رہی تھی!

خلا گا رہی تھی!

یہی گیت ہے جس نے میری محبت کی نیندیں اڑائیں

یہی گیت ہے

جس نے وجدان کے مرمریں گنبدوں پہ

وہ ضربیں لگائیں

کہ میں اس پُر اسرار خلوت میں

گھبرا رہا ہوں

بلندی پہ ہوں

قافلوں سے مگر کتنا پیچھے جا رہا ہوں!

پکارو مجھے

ساتھیو اس بلندی سے آ کر اتارو مجھے

کارواں آدمیت کے آگے بڑھے جا رہے ہیں

مجھے ساتھ دینا ہے ان خود نگر قافلوں کا

جنھیں اپنی قوت پہ ایمان ہے

جن میں مزدور ہیں اور دہقان ہیں

جن میں انسانیت کے محافظ ہیں

جو صرف انسان ہیں

جن کے ہاتھوں پہ مٹی ہے

بالوں میں تنکے ہیں

ہونٹوں میں پیاسیں ہیں

ملبوس پہ سرخ دھبے ہیں

آنکھوں میں قندیل کی جھلملاہٹ ہے

اے ساتھیو

اس پر اسرار سناٹے میں گونجتی گنگناتی ہوئی

کس کی آہٹ ہے؟

یہ کتنی صدیوں کا روندا ہُوا آدمی ہی نہ ہو

ساتھیو!

یہ مرے کھوج میں خود مری زندگی ہی نہ ہو

میں بلندی سے تنہا اُترنے لگا ہوں

پلٹ کر ذرا مجھ کو پہچان لو

میں تمھارا ہوں

تم میں سے ہوں

آج سے زندگی کا پُجاری ہوں

محنت کشوں کی جبینوں کی تابندگی کا پجاری ہوں

انسانیت کے مقدّر کی رخشندگی کا پجاری ہوں

میں زندگی کے لیے اپنے فن کا فسوں نذر لایا ہوں

تابندگی کے لیے اپنا خوں نذر لایا ہوں

رخشندگی کے لیے اپنا سوزِ دروں نذر لایا ہوں میں

۱۹۳۹ء

وقت

سر بر آوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
چاند بلّور کی ٹوٹی ہُوئی چُوڑی کی طرح اٹکا ہے
دامنِ کوہ کی اک بستی میں
ٹمٹماتے ہیں مزاروں پہ چراغ
آسماں سرمئی فرغل میں ستارے ٹانکے
سمٹا جاتا ہے، جھکا آتا ہے
وقت بیزار نظر آتا ہے!

سر بر آوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
صبح کی نقرئی تنویر رچی جاتی ہے
دامنِ کوہ میں بکھرے ہوئے کھیت
لہلہاتے ہیں تو دھرتی کے تنفّس کی صدا آتی ہے

آسماں کتنی بلندی پہ ہے، اور کتنا عظیم
نئے سورج کی شعاعوں کا مصفّا آنگن
وقت بیدار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
آفتاب ایک الاؤ کی طرح روشن ہے
دامنِ کوہ میں چلتے ہوئے ہل
سینۂ دہر پہ انسان کے جبروت کی تاریخ رقم کرتے ہیں
آسماں تیز شعاعوں سے ہے اس درجہ گداز
جیسے چھونے سے پگھل جائے گا
وقت تیار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
زندگی کتنے حقائق کو جنم دیتی ہے
دامنِ کوہ میں پھیلے ہوئے میدانوں پہ

ذوقِ تخلیق نے اعجاز دکھائے ہیں لہو اُگلا ہے
آسماں گردشِ ایام کے ریلے سے ہراساں تو نہیں
خیر مقدم کے بھی انداز ہُوط کرتے ہیں
وقت کی راہ میں موڑ آتے ہیں، منزل تو نہیں آسکتی!

۱۹۴۹ء

آخری فیصلہ

میری معصوم بیٹی کا اجلا تبسّم
جیسے شبنم کے قطرے میں خورشید کا اوّلیں لمس گھُل جائے!
میری بہنوں کی آنکھوں میں پاکیزگی کی چمک
جیسے برفوں سے آراستہ پربتوں میں ستارے اُتر آئیں!
میری بیوی کے چہرے پہ تخلیق کے ولولے، پرورش کے عزائم
جیسے دھرتی کے شاداب سینے پہ گندم کے اکھوے!
میرے بھائی کے ہاتھوں کی مانوس گرمی
جیسے سرما کی بھیگی ہوئی صبح میں دھوپ مل جائے
میری ماں کا بڑھاپا خلوص اور محبّت کا بارِ امانت اٹھائے ہوئے
ڈوبتے چاند کی چاندنی، سوکھتے گلشنوں کا تعطّر!
میرے ابّا کی تربت پتاور میں ڈوبی ہوئی
جیسے اُمڈے ہوئے بادلوں میں نہاں مہرِ تاباں!

میرے احباب کی دندناتی ہوئی محفلیں
جیسے دریا چٹانوں سے ٹکرا کے ہٹتے ہوئے، گھوم جاتے ہوئے، گنگناتے ہوئے!

میرا فن، میری انسانیت، میری تہذیب، میرا تمدن، مری زندگی، میری دنیا
میں ان کی بہار آفرینی کا اک خود نگر پاسباں ہوں
خزاں ان کی جانب ہزار اپنے پنجر کا سایہ گرائے
مگر ان میں کلیاں چٹکتی رہیں گی، شگوفے نکلتے رہیں گے، خیاباں مہکتے رہیں گے
کہ آج ایک انساں کا دل ساری انسانیت کا حرم ہے
آج دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں — ایک انسان ہیں
آج ایک آدمی آدمیت مجسم ہے
اور آدمیت کا یہ آخری فیصلہ ہے —
کہ ہم اپنی دنیا کو ویران ہونے نہ دیں گے
ہم نئی جنگِ عالم کا اعلان ہونے نہ دیں گے

سنہ ۱۹۵۰ء

نیا ایشیا

(ظلم کے خلاف لڑنے والے فن کاروں کے نام)

۷؍فروری ۱۹۳۱ء کو چین میں چیانگ کائی شیک کی حکومت نے چھ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

۷؍فروری ۱۹۴۹ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور نے ان چھ فن کاروں کی یاد میں ایک خاص اجلاس منعقد کیا۔ یہ نظم اسی موقع پر لکھی اور پڑھی گئی

زندگی کے ہیولے بناتا رہا ایشیا
زندگی سے بہت دور جاتا رہا ایشیا
ایشیا ایک ایسا کھلونا رہا جس میں یورپ سدا کوک بھرتا رہا
ایشیا کے ذخیروں میں غلّے کے بدلے فرنگی سدا بھوک بھرتا رہا
ایشیا ایشیائی کے ہاتھوں سے پیہم نکلتا رہا
ایشیا ایک ایسے خطرناک سانچے میں ڈھلتا رہا
جس میں مفلس کی پرچھائیں دھجّی سی بن کر لٹکنے لگے
جس میں مجبور کی آہ کانٹا سا بن کر اٹکنے لگے

جس میں دہقان جائے تو اپنے لہو سے گلستانِ شاہی سجاتا پھرے
جو بھی انسان جائے وہ انسانیت کی ہزیمت کا پرچم اڑاتا پھرے
جس میں بچّے کی چیخیں کھنکنے لگیں
جس میں عورت کی آہیں چھنکنے لگیں
جس میں بیوہ کے آنسو نگینے بنیں
جس میں عصمت کے بالے دفینے بنیں
جس میں نمرود جھانکے تو عود اور عنبر کی خوشبو کا سیلاب گانے لگے
جس کو مزدور چھو لے تو کژدم اڑیں اور اژدر کی پھنکار آنے لگے
ایشیا اک نہایت خطرناک سانچے میں ڈھلتا رہا
ایشیا ایشیائی کے ہاتھوں سے پیہم نکلتا رہا

کون جانے سیاست بہ ایں دعویٔ ارتقا کتنے پانی میں ہے
کون جانے کہ وقت آج ساکن ہے یا حسبِ عادت روانی میں ہے
کون جانے کہ انسان اپنی طہارت کو محکوم رہ کر بھی کھوتا نہیں
کون جانے کہ آدم مظالم کے پاٹوں میں پس کر بھی نابود ہوتا نہیں
کون جانے کہ جب شاخ پر برف جمتی ہے، کونپل کی تخلیق رکتی نہیں

کون جانے کہ بہتے ہُوئے پانیوں میں کرن ٹوٹ سکتی ہے، جھکتی نہیں

کون جانے، کہ اُجڑی ہُوئی وادیاں کن بہاروں کو تکتی ہیں شام و سحر

کون جانے، سپاٹ آسمانوں پہ رہتی ہے کیوں تشنہ لب گلستنوں کی نظر

کون جانے، تضاد ایک دیرینہ دستور ہے

کون جانے، کہ ہر تیرگی میں نہاں نور ہے

کون جانے، شرفِ آدمیت کا فانی نہیں

کون جانے کہ یہ بیش قیمت صداقت کہانی نہیں

کون جانے کہ راتوں کے دامن میں جو ظلمتیں ہیں، ستاروں سے لبریز ہیں

کون جانے کہ سیلاب کی راہ میں سر برآوردہ کہسار مہمیز ہیں

کون جانے کہ طوفاں کی آغوش میں جتنے کانٹے ہیں اتنی ہی کلیاں بھی ہیں

کون جانے، مؤرخ کی نظروں میں اس وقت محلوں کے ہمراہ گلیاں بھی ہیں

کون جانے کہ بھوبھل کی چنگاریاں اک فلک رس الاؤ کی غماز ہیں

کون جانے کہ جمہور کی میتیں ماضی و حال میں محوِ پرواز ہیں

یہ وہی جانتے ہیں جو احساس کی نرم پوروں سے چھوتے ہیں نبضِ جہاں

یہ وہی جانتے ہیں جو بھولے نہیں آدمی زار میں آدمی کا نشاں

یہ وہی لوگ ہیں جن کو سکوں کی جھنکار ڈستی نہیں
یہ وہ انسان ہیں جن کی انسانیت اتنی سستی نہیں
یہ وہی "لاابالی" ہیں جن کی خموشی میں پوشیدہ چیخوں کا طوفان ہے
یہ وہی "سر پھرے" ہیں جنھیں اب بھی انسان کی سرفرازی پہ ایمان ہے
یہ وہی ہیں جنھیں تیز آنچوں میں پالا گیا
یہ وہی ہیں جنھیں بھٹیوں میں اچھالا گیا
یہ وہی ہیں جو شاہوں کو نوکِ قلم سے پچھاڑا کیے
یہ وہی ہیں جو فغفور و خاقان تک کو لتاڑا کیے
یہ وہی ہیں کہ جن کا لہو مشعلیں بن کے ہر دیس میں جگمگاتا رہا
یہ وہی ہیں کہ جن کا جنازہ نشانِ سفر بن کے رستہ دکھاتا رہا
یہ وہ سردار ہیں جن کے ہاتھوں میں باگیں ہیں ایام کی
یہ وہ سرکش ہیں جن کو ستاتی نہیں فکر انجام کی
یہ وہی ہیں جنھیں سربلندوں کا معتوب ہونا پڑا
یہ وہی ہیں جنھیں ہر زمانے میں مصلوب ہونا پڑا
یہ وہی لوگ ہیں جن کی ہیبت سے روحِ زمانہ لچکتی بھی ہے اور دھڑکتی بھی ہے
یہ وہی لوگ ہیں جن کی تحریر میں زندگی لہلہاتی بھی ہے اور بھڑکتی بھی ہے

چند ایسے ہی فن کار تھے جن کے ہونٹوں پہ تاریخ کی گرد جمنے نہ پائی کبھی
ان کے سینوں سے جو دھار پھوٹی لہو کی وہ دینگ ستی کی مانند تھمنے نہ پائی کبھی

یہ وہ اہلِ قلم تھے کہ جن کا تھا معیارِ فن زندگی کی نمائندگی
ظلمتوں کے جگر سے جنھوں نے نچوڑی تھی اک غیر فانی درخشندگی

یہ وہی تھے جنھوں نے گراں مایہ جمہوریت کو نہ بیچا کسی اجنبی ہات میں
یہ وہی تھے جو مینارِ انوار بن کر چمکتے رہے ایک لمبی سیہ رات میں
یہ وہی تھے جو یورپ کے سوداگروں کو ڈپٹتے رہے —

"ہم نہ بیچیں گے بھولے سے بھی آبروئے وطن
گنگناتی ہوئی ندیاں ہیں ہماری، ہماری ہیں یہ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں مسکراتے چمن
زرد مٹی کا ایک ایک دانہ ہمارا ہے، ہم چینیوں کا خزینہ ہے یہ
چاولوں کے اس انبار کو چھوڑ دو، ہم کسانوں کا جلتا پسینہ ہے یہ
ہم کروڑوں کی محنت کو کیوں چند لوگوں کی جھولی میں ڈالیں بھلا
ہم غلامی کے اک نقرئی روپ کا راستہ کیوں نکالیں بھلا

قلبِ جمہور کو بھون کر ایک آمر ضیافت اُڑاتا پھرے!
اور فن کار خوابوں کے اُلجھے ہوئے تانے بانے اُڑاتا پھرے!
آدمیت امانت ہے فن کار کی، اور دیانت کا ہے دوسرا نام فن

اور ہمارے دلوں کو ہے اس فن کی تابندگی و درخشندگی کی لگن
ہم نے اک عزم سے اپنے ملبے سے خود اپنی تعمیر کی
جانے کس زعم میں تم سناتے ہو جھنکار زنجیر کی!"

یہ وہ آواز تھی جس کو پیہم دبایا گیا
یہ وہی آگ تھی جس کو صدیوں بجھایا
یہ وہی سیل تھا جس کے رستے میں کہسار حائل ہوئے
یہ وہی پھول تھا جس کی پوجا پہ گلزار مائل ہوئے
زندگی چار سُو پھڑپھڑانے لگی
آدمیت معاً مسکرانے لگی

خود شناسی کا سیلاب اس زور سے چین کی سرزمیں پر مچلنے لگا
جیسے اک منجمد اور ساکن سمندر اچانک چٹخ کر اُبلنے لگا
ہل کی ہتھی پہ جو ہاتھ جمتے رہے یوں بڑھے جیسے تارے اُڑا لائیں گے
گرد آلود پاؤں اُٹھے اس طرح جیسے دھرتی کو ہموار کر جائیں گے
اس تغیّر کو تاریخ داں کی زباں میں بغاوت کہیں
یا ستم خوردہ انسانیت کی زباں میں طہارت کہیں

یہ اس آواز کا ایک اعجاز تھا جس کو بہ ہم دبایا گیا
یہ اسی آگ کا ایک انداز تھا جس کو صدیوں بجھایا گیا
آمریت طہارت کی بدخواہ ہے، آمریت کو طیش آ گیا
یہ وہ نعرہ تھا جو گونج کر اجنبی زر پرستوں کو چکرا گیا
چھ ادیبوں کو شنگھائی میں ٹھوکروں سے اُچھالا گیا
فن کی بھڑکی ہوئی آگ پر خونِ فن کار ڈالا گیا

جو زبانیں کہ اعلانِ حق میں کٹیں، احتجاجِ مسلسل بنیں ایک دن
جو کراہیں گلے میں دبا دی گئیں، آسماں پوش بادل بنیں ایک دن
جو ترانہ کہ تلوار کے وار سے بیچ میں کٹ گیا، اک سبق بن گیا
خون جو جذب ہوتا رہا خاک میں، صبحِ نو کے افق کی شفق بن گیا
نوجواں فن طرازوں کی لاشوں سے پھوٹی وہ کونپل جو اب ایک گلزار ہے
یہ تعطر جو اٹھکیلیاں کر رہا ہے، اسی گُل کدے ہی کی مہکار ہے
برِ اعظم کے فرمانروا اب سمٹ کر جزیروں کو آباد کرنے لگے
جو کروڑوں کی فریاد سے بے خبر تھے، زمانے سے فریاد کرنے لگے

یہ انہی چھ ادیبوں کا فیضان ہے

چمن کے ذرّے ذرّے میں ہیجان ہے
یہ وہ ہیجان ہے جو گجردم ستاروں میں دیکھا گیا
جو بہاروں سے پہلے اُجڑتے نظاروں میں دیکھا گیا
خونِ ناحق سدا رنگ لاتا رہا
گو مؤرخ اسے بھول جاتا رہا
خون اور وہ بھی مخلص قلم کار کا، حرّیت کے صحیفے کا عنوان ہے
خون فن کار کا اصل میں اُمّتوں کے شگفتہ مقدّر کی پہچان ہے
جس شہادت کا انجام ہے زندگی
اس کا اک دوسرا نام ہے زندگی

اے مرے ہم نصیبو، مرے ساتھیو، اے مرے دوستو، اے مرے ہم صفیرو، اُٹھو
نے روایاتِ محکومیت کے روپہلی مگر ٹوٹے پھوٹے قفس کے اسیرو، اُٹھو
دیکھو دیکھو، ہری ڈالیوں پر چمکتے ہیں پھولوں کے تارے، اُٹھو
دیکھو دیکھو، ہرن ہر طرف دشت میں بھر رہے ہیں طرارے، اُٹھو
دیکھو دیکھو، وہ خورشید افق پر ٹھٹک کر خدا جانے کیوں مسکرانے لگا

دیکھو دیکھو، سنہری دھندلکا بہت دور ہٹ کر ہمیں کو بلانے لگا

ہم مساوات کے جب علمدار ہیں، کیوں وہی ہیں نشیب و فرازِ جہاں

جب ہمیں آشیاں کی بنا ڈالتے ہیں، ہمیں سے گریزاں ہے کیوں آشیاں

جب ادب زندگی کا اک آئینہ ہے تو یہ آئینہ ہر آدمی کو دکھاتے چلو

جب کوئی نقشِ باطل نظر آئے تم کو، تو اس کو خود اپنے لہو سے مٹاتے چلو

خونِ فن کار پھولوں سے بڑھ کر حسیں اور بہاروں سے بڑھ کر تعطر فشاں

خونِ فن کار ہیں ہیں تمام آدمیّت کی سب نو دمیدہ اُمنگیں رواں

اے رفیقو، تمھی سے فنا گاہِ عالم میں رنگِ دوام آئے گا

اب تمھارے لہو کا جو قطرہ گرے گا وہ نسلوں کے کام آئے گا

پھر افق کی کماں میں تناؤ سا ہے

قلبِ انساں میں پھر ایک گھاؤ سا ہے

ایشیا منتظر ہے کہ انسانیت اس کے رمنوں میں گانے لگے، چہچہانے لگے

آؤ آؤ، قدم یوں اُٹھاؤ، کہ لاکھوں کروڑوں شہیدوں کی محنت ٹھکانے لگے

۱۹۴۹ء

(۵)

غزلیں

ازاں زماں کہ بحافظ رسید صوتِ حبیب
فضائے سینہ ز شوقم ہنوز پر ز صدا است

○
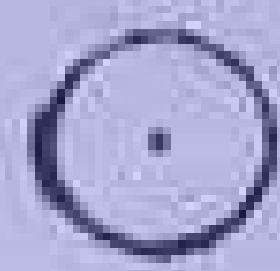
صبح میں دیکھتا ہوں شام کے آثار ابھی
زیست ہے میرے لیے مستقل آزار ابھی

میں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں، تو فرطِ حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی

راہیں لُٹ سی گئیں، مٹ سے گئے قدموں کے نقوش
سُن رہا ہوں تری پازیب کی جھنکار ابھی

تیرے پیکر کے تصوّر سے، خزاں کے باوصف
شاخِ گُل صحنِ گلستاں میں ہے گل بار ابھی

پرفشاں کب سے فضا میں ہے مری مشتِ غبار
تیری آنکھوں کے ثوابت نہیں سیّار ابھی

کشتِ ویراں! ابھی برسات کی رُت باقی ہے
بدلیاں جھوم رہی ہیں سرِ کہسار ابھی

ابھی انسان کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
نہرِ مہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی

کتنے ساگر ہیں سنبھالے ہُوئے ناسفتہ گہر
کتنے اسرار ہیں آمادۂ اظہار ابھی

ضبط، اے شوخیٔ گفتار، سنبھل اور سنبھال
ڈھل رہا ہے مرے احساس میں کردار ابھی

ابھی نسلوں کے اک انبوہ میں محبوس ہوں میں
آدمیّت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی

مژدۂ حرّیتِ فکر سنانے والو!
کتنے منصور ہیں موجود سرِ دار ابھی!

مئی ۱۹۴۷ء

○
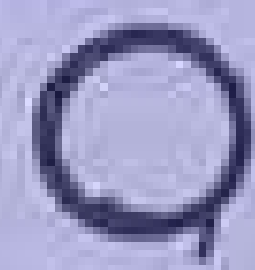
اگر حضور ابھی مائلِ ظہور نہ تھے
تو تشنگانِ محبت بھی ناصبور نہ تھے

افق کی دُھند میں لپٹے ہُوئے چراغ سے ہیں
وہ دن جب آپ کے انداز پُر غرور نہ تھے

جزا تو خیر، سزا کے لیے ترستے رہے
غلام آپ کے، اتنے تو بے قصور نہ تھے

پسِ نقاب مری بے بسی پہ قہقہہ زن
میں جانتا ہوں کہ تقدیر تھی حضور نہ تھے

رسائی اصل میں ہے انتہائے سرشاری
مسافرانِ محبت تھکن سے چور نہ تھے

مرے نصیب کو کیوں تابعِ نجوم کیا
اگر نجوم مری دسترس سے دُور نہ تھے

میں مصلحین کا منکر نہیں ندیم — مگر
کسی کے مدِّ نظر عشق کے امور نہ تھے

مئی ۱۹۲۷ء

○
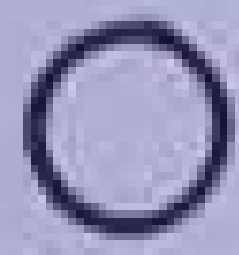
بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب تیرے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلاوے تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا، مگر کرو نہ بہانہ
جھکا قمر نہ دکھاؤ، بجھا چراغ جلاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا، کہ دل کے دیپ جلاؤ

اجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دوانے، اُتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمھاری بات چلی ہے، مری حسین خطاؤ!

اِدھر شباب کا مس ہے، اُدھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے، ندیم دیکھتے جاؤ

○
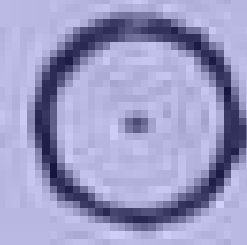
مرے سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں!
کہیں مزاجِ زمانہ بہانہ جُو تو نہیں!

ندی کی رَو میں رواں ہے جو ایک برگِ گلاب
کہیں شباب کا ایوانِ رنگ و بُو تو نہیں!

مچل مچل کے اُبھرتی ہے جب چراغ کی لو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تُو تو نہیں

یہ سب درست، شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی
مگر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں

اُفق کی سمت تو قرنوں سے چل رہا ہے ندیمؔ
کہیں یہ راہنما مجھ سا راہ جُو تو نہیں

فروری ۱۹۴۷ء

○
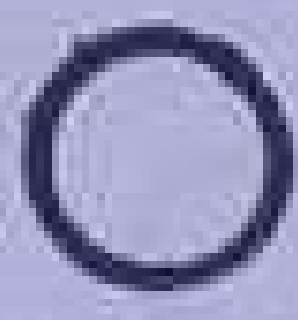
ابھی نہیں اگر اندازۂ سپاس ہمیں
تو کیوں ملی تھی بھلا تابِ التماس ہمیں

افق افق پہ نقوشِ قدم نمایاں ہیں
تلاش لائی کہاں سے تمھارے پاس ہمیں

کبھی قریب سے گزرے، بدن چرائے ہُوے
تو دُور تک نظر آتے رہے اداس ہمیں

جو ہو سکے تو اس ایثار پر نگاہ کرو
ہماری آس جہاں کو، تمھاری آس ہمیں

ڈبو چکا ہے امنگوں کو جس کا سنّاٹا
بلا رہا ہے اسی بزم سے قیاس ہمیں

یہ پوچھنا ہے، کب آدم زمیں پہ اُترے گا
جو لے چلے کوئی کامل، خدا کے پاس ہمیں

یہیں ملیں گے تمھیں پھول بھی، ستارے بھی
بنا رہی ہے دل آویزئ لباس ہمیں

۱۹۴۷ء

○
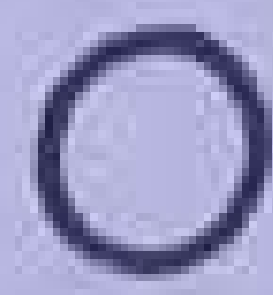
میں کب سے گوش بر آواز ہوں، پکارو بھی
زمیں پہ یہ ستارے کبھی اُتارو بھی

مری غیور امنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اُداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمھی لیکن
نقاب اُٹھاؤ، نشانِ سفر اُبھارو بھی

یہ کائناتِ ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم! تم اس بوجھ کو سہارو بھی

۱۹۴۷ء

○
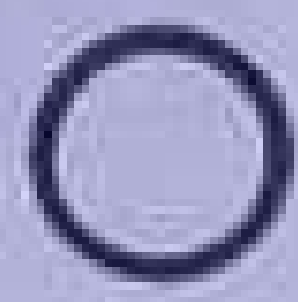
لبوں میں زمزمِ تبسم رچا کے گھل جائیں
خدا کرے مرے آنسو کسی کے کام آئیں

جو ابتدائے سفر میں دیئے بجھا بیٹھیں
وہ بد نصیب کسی کا سراغ کیا پائیں

تلاشِ حسن کہاں لے چلی، خدا جانے
امنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں

تمام میکدہ سنسان، میگسار اُداس
لبوں کو کھول کے کچھ سوچتی ہیں مینائیں

بلا رہے ہیں افق پر وہ زرد رُو ٹیلے
کہو تو ہم بھی فسانوں کے راز ہو جائیں

نہ کر خدا کے لیے بار بار ذکرِ بہشت
ہم آسماں کا مکرّر فریب کیوں کھائیں

نہیں نہیں، ترے عرفان کا سوال نہیں
جو اذن ہو تو حدِ آگہی سے بڑھ جائیں

ندیمؔ کو بھی تو مڈ بھیڑ کی امید نہ تھی
اس اتفاق پہ آپ اس قدر نہ شرمائیں

۱۹۴۷ء

○
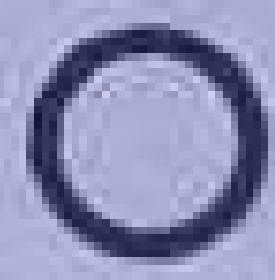
یہ رزم گاہِ عناصر کسی کے کام آئے
خدا کرے مرے بس میں ترا نظام آئے

شباب، گردِ سفر ـــ زندگی، فریبِ نظر
تری تلاش میں ایسے کئی مقام آئے

شکستہ پر ہے ابھی فلسفہ اسیروں کا
قفس کو توڑ کے نکلے تو زیرِ دام آئے

سمجھ میں آ نہ سکا یہ طلسمِ لیل و نہار
کہ دن طلوع نہ ہو پائے، اور شام آئے

نہ جانے کون سا آدم ہے آپ کا معیار
کہ ہم تو عرش پہ جا کر بھی ناتمام آئے

سنہ ۱۹۴۷ء

○

فریبِ رنگ عیاں ہے، جدھر نگاہ کروں
ضمیرِ پاک، بتا، کس کے دل میں راہ کروں

نئے چراغ جلا لوں، مگر یہ عزمِ صمیم
کہ شمعِ کشتہ سے ہر حال میں نباہ کروں

مجھے وہ کیف گوارا نہیں جو فانی ہو
کوئی بتائے کہ اب کون سا گناہ کروں

کلی کلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو
کسے گلے سے لگاؤں، کسے تباہ کروں

یہ جرم ہے کہ میں کمہ دوں پرست کیوں نہ ہُوا
جو اذن ہو تو ترے حسن کو گواہ کروں

یہ آرزو ہے کہ تیری پناہ کو تج کر
میں تیرے لطف و کرم کو جہاں پناہ کروں
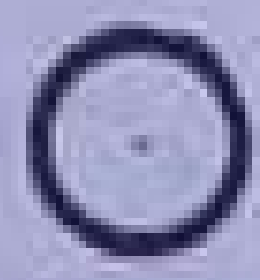
۱۹۴۷ء

○

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ کیا کھولی، چمن مرجھا گئے

کون تھے آخر جو منزل کے قریب
آئنے کی چادریں پھیلا گئے

کس تجلّی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

اک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب
اک پہیلی بن کے ہر سُو چھا گئے

پھر وہی اختر شماری کا نظام
ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے

رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی!
آج سیّارے اگر ٹکرا گئے؟

جن کو ہم سمجھا کیے ابرِ بہار
وہ بگولے کتنے گُلشن کھا گئے

کیا رسا نکلی دعائے اجتہاد
لیجیے! اگلے زمانے آ گئے

آدمی کے ارتقا کا مدّعا
وہ چھپاتے ہی رہے، ہم پا گئے

اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

۱۹۴۸ء

○
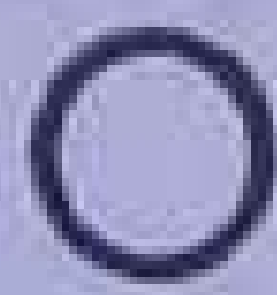
دستِ گل چیں میں کھل رہی ہے کلی
میرے جینے سے اس کی موت بھلی

ابتلاء ابتدائے ذوقِ عمل
یعنی طوفاں اُٹھا تو ناؤ چلی

صبحِ زرّیں، چتا امنگوں کی
رات کے ساتھ ہی وہ بات ٹلی

شاخِ امّید کی بہار نہ پوچھ
برسوں پھولی مگر کبھی نہ پھلی

چشمِ سرشار میں حیا چمکی
ساغرِ مے میں چاندنی کی ڈلی

گردشِ چشم ہے کہ گردشِ دہر
پلکیں جھکنے لگیں کہ دھوپ ڈھلی

کائنات ایک دشتِ بے انجام
اب کہاں ڈھونڈیئے کسی کی گلی

۱۹۴۸ء

○
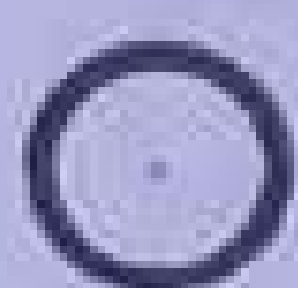
رس میں جو بات ہے وہ مَس میں نہیں
اب مرا عشق میرے بس میں نہیں

جس میں گُھل جائے خود جرس کا وجود
اک وہ نغمہ ابھی جرس میں نہیں

کس نے ڈھالا تھا پیکرِ آدم
کوئی لذّت اگر ہوس میں نہیں

کلیاں کِھلتی ہیں شاخوں پر
کائنات اب کسی کے بس میں نہیں

شانِ اظہار آنسوؤں کی ندیم
میری فریادِ دُور رس میں نہیں

سنہ ۱۹۴۸ء

○
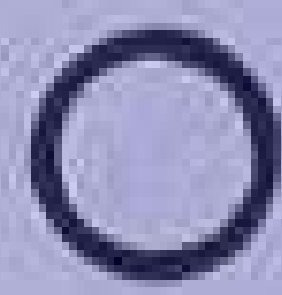
گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

آدمی شش جہات کا دولھا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

فیصلے کر رہے ہیں عرش نشیں
آفتیں آدمی پہ آتی ہیں

کلیاں کس دَور کے تصوّر میں
خون ہوتے ہی مسکراتی ہیں

تیرے وعدے ہوں جن کے شاملِ حال
وہ امنگیں کہاں سماتی ہیں

۱۹۴۹ء

○
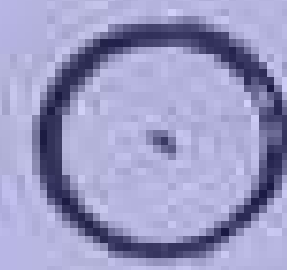
نہاں ہے محشرِ آہنگ زیرِ پردۂ ساز
تری تھکن ہے ترے اضطراب کی غمّاز

مرے نیاز کی تکمیل کس طرح ہوگی
اگر میں پا نہ سکا تیری بے رُخی کا جواز

یہ تیری چاپ ہے یا میرے دل کی دھڑکن ہے
بہت قریب سے آئی ہے دُور کی آواز

بُرا نہ مان، تو دامن سے چُن لوں اشک ترے
کہ میں ہی تھا تری دوشیزگی کا آئنہ ساز

ترے غرور میں پنہاں مرا غرورِ شکست
میں تیرے راز نہ کھولوں گا، میرے محرمِ راز

ابھی کچھ اور سُلگنا ہے وقت کی لَو پہ
ابھی نہیں مرے معیارِ زندگی میں گداز

غبار، اوجِ بصارت - ستارے بارِ نظر
بہت لطیف ہیں احساس کے نشیب و فراز

کچھ ایسا نرم ہُوا میرا ذوقِ خودنگری
مرے لیے مرا دشمن بھی ہے مراد مساز

ندیم! فلسفۂ صبر کو دعائیں دیں
بایں غریب کُشی، جو رہے غریب نواز

اگست ۱۹۴۹ء

○
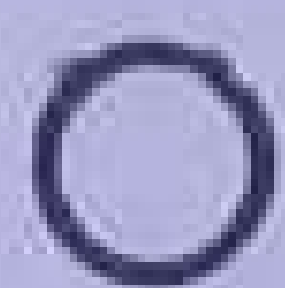
بن ہو، ابر ہو، تیز ہوا ہو — تیرے حسن کا دیا جلا ہو
پَو بھی پھٹی، طوفاں بھی اُٹھا — اب کوئی کیا جانے کیا ہو
آج کی کلیاں کب چٹکیں گی — شاید مستقبل کو پتا ہو
چاند بھی ساکن، وقت بھی ساکن — شاید تو کچھ سوچ رہا ہو
پت جھڑ میں کیوں پھول نہ ڈھونڈے — جس نے تجھے کھو کر پایا ہو
بیلیں سی بل کھاتی ہیں جب — کوئی سہارا ٹوٹ چلا ہو
تو نے یوں شرما کر دیکھا — جیسے تھک کر دیا بجھا ہو
میری تنہائی کی دعا ہے — تیرے ساتھ بھری دنیا ہو
وقتِ سحر یوں کلیاں چٹکیں — جیسے تیرا نام لیا ہو
انساں کا معیار یہی ہے — خوب دکھی ہو، خوب اچھا ہو
دیئے بجھے ہیں، پھول کھلے ہیں — شاید یہ شہراہِ صبا ہو

تو کہتا ہے تارا ٹوٹا
اور اگر آنسو ٹپکا ہو!

۱۹۴۹ء

○
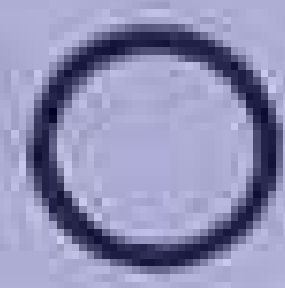
افق نہاں ہے تو حدِّ نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں، سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں، بحر و بر کا ذکر کریں
بہت بلند ہے فردوس — گھر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہُر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حسنِ نظر کا ذکر کریں

خزاں کو بوئے گُل و نسترن سے چھلکا دیں
اگر بہار نہیں، برگ و بر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضور فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے، اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگزر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بے چارگی ہے چارہ گری
تو کس امید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر کیے چاک دامنی کے گلے
بعزمِ بخیہ گری، بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیم! مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

سنہ ۱۹۵۰ء

○
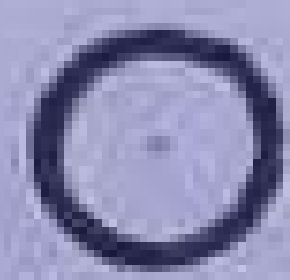
بڑی مانوس لَے میں ایک نغمہ سُن رہا ہوں میں
کسی ٹوٹی ہُوئی چھاگل کی کڑیاں چُن رہا ہوں میں

یہاں اب اُن کے اظہارِ محبت کا گزر کیا ہو
کہ سناٹے کی موسیقی پہ بھی سر دُھن رہا ہوں میں

شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سُن رہا ہوں میں

تصوّر میں ترے پیکر کا سونا گھُل گیا ہوگا
ابھی تک لمس کی کیفیتوں میں بھُن رہا ہوں میں

خدا کا شکر، احساسِ زمیں مرنے نہیں پایا
ستارے چننے نکلا تھا، شرارے چُن رہا ہوں میں

سنہ ۱۹۵۰ء

○

ہجومِ فکر و نظر سے دماغ جلتے ہیں
وہ تیرگی ہے کہ ہر سُو چراغ جلتے ہیں

کچھ ایسا تند ہُوا جا رہا ہے بادۂ زیست
کہ ہونٹ کانپتے ہیں اور ایاغ جلتے ہیں

چٹک رہے ہیں شگوفے، دہک رہے ہیں گلاب
وفورِ موسمِ گُل ہے کہ باغ جلتے ہیں

نہیں قریب تو کچھ دُور بھی نہیں وہ دور
شفق کے روپ میں جس کے سراغ جلتے ہیں

ترے نصیب میں راتیں، مرے نصیب میں دن
ترے چراغ، مرے دل کے داغ جلتے ہیں

۱۹۵۰ء

○

اگرچہ آج وہ اگلا سا التفات نہیں

میں شکوہ سنج نہیں، تو خدا کی ذات نہیں

وہ نغمہ گر نہیں صرف ایک مرثیہ خواں ہے

کہ جس کے چنگ میں آہنگِ کائنات نہیں

مری شکست میں انسانیت ہے نالہ کناں

یہ سانحات فقط میرے سانحات نہیں

چراغِ راہ ہے بے اِغرورِ خودنگری

فقط خدا کی پرستش رہِ نجات نہیں

میں گُل کو دیکھ کے تخلیقِ گُل کی سوچتا ہوں

گُلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں

یہ راستے تو مرے ہاتھ کی لکیریں ہیں

جو تُو رفیقِ سفر ہو تو رات، رات نہیں

۱۹۵۰ء

○
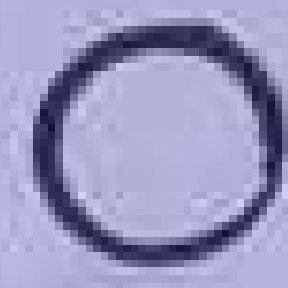
ہم اپنی قوتِ تخلیق کو اُکسانے آئے ہیں

ضمیرِ ارتقا میں بجلیاں دوڑانے آئے ہیں

جو گردش میں رہیں گے اور کبھی خالی نہیں ہوں گے

ہم ایسے جام بزمِ دہر میں چھلکانے آئے ہیں

اجل کی رہزنی سے ہر طرف طاری ہیں سنّاٹے

سرودِ زندگی کو نیند سے چونکانے آئے ہیں

ہوائیں تیز ہیں، جل جل کے بجھتے ہیں چراغ اپنے

ارادے تند ہیں، ہم شمعِ نو بھڑکانے آئے ہیں

وہ دیوانے جو ہمت ہار کر بیٹھے تھے صدیوں سے

اب اپنی منجمد تقدیر سے ٹکرانے آئے ہیں

عروسِ زندگانی کا سوئمبر رچنے والا ہے

نئے ارجن مشیّت کی کماں لچکانے آئے ہیں

اگست ۱۹۵۰ء

○
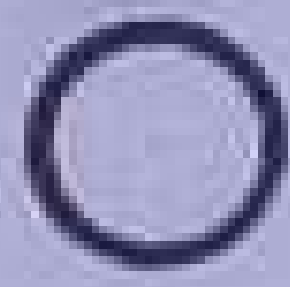
چراغِ مردہ کو اک بار اور اُکساؤں
دیا بجھے تو سحر کا فریب کیوں کھاؤں

خدا کے کام جو آتے، خدا بنائے گئے
میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

میں رنگ و نغمہ و رقصِ حیات ہوں یعنی
ضمیرِ دہر ہوں، شاہوں کے ہاتھ کیا آؤں

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

ستارے ٹوٹ کے کلیوں کے روپ میں چٹکیں
ذرا زمیں کے پندار کو جو اُکساؤں

کسی کی زلف بھی منت پذیرِ شانہ تھی
مگر میں گیسوئے گیتی تو پہلے سلجھاؤں

کئی برس سے مجھے مل رہا ہے درسِ خودی
یہی کہ تیرگیوں میں ہوا سے ٹکراؤں

میں اب سے دور فرشتوں کے گیت لکھتا رہا
یہ آرزو ہے کہ اب آدمی کو اپناؤں

سنہ ۱۹۵۰ء

○
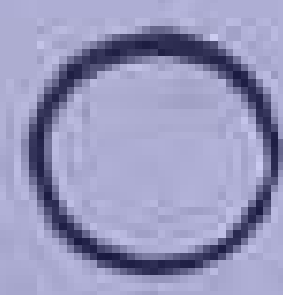
ہوا لپکتی رہے، میرا کارواں تو چلے
برا نہیں اگر اک بار پھر چراغ جلے

غمِ حیات سے لوں گا رمِ حیات کا درس
تمام عمر شکستوں پہ کون ہاتھ ملے

کسے خبر کہ دھڑکتا ہے آفتابِ سحر
ٹھٹھرتے بھیگتے تاروں کی نرم چھاؤں تلے

کڑھو نہ راہنماؤں کے عہد و پیماں پر
یہ وہ چمن ہیں جو پھولے مگر کبھی نہ پھلے

کسی کے طرزِ بیاں کا فریب کیوں کھاؤں
کہ بات ایک ہے سائے بڑھیں کہ دھوپ ڈھلے

زمیں کا درس تو کس طرح قبول کریں
جو ایک عمر خلا میں رہے، فلک میں پلے

ندیمؔ! جن کے ارادوں میں ڈھل رہی ہے حیات
ہم ایسے "فن کے اماموں" سے وہ عوام بھلے

۱۹۵۰ء

○

یوں بیکار نہ بیٹھو دن بھر، یوں پیہم آنسو نہ بہاؤ
اتنا یاد کرو کہ بالآخر آسانی سے بھول بھی جاؤ

سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں ان کو لب پر لاؤ
دھوکا دینے والا روئے، ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

ظلمت سے مانوس ہیں آنکھیں، چاند اُبھرا تو مند جائیں گی
بالوں کو اُلجھا رہنے دو، اک اُلجھاؤ سو سلجھاؤ

کل مجھ پر الزام تھا سارا، آج تو فق ہے رنگ تمھارا
کل تم مجھ سے شرمائے تھے آج آئینے سے شرماؤ

پہلو تو لُٹ جائے گا لیکن آنکھیں تو ویراں نہ رہیں گی
بے شک میرے پاس نہ بیٹھو لیکن اتنی دُور نہ جاؤ

رس کا زمانہ بیت چکا ہے، اب مس ہے معراجِ محبت
میں اِس دَور کا دیوانہ ہوں، دل میں نہیں، نظروں میں سماؤ

کل کو کل پر رکھو، جب کل آئے گا دیکھا جائے گا
آج کی رات بہت بھاری ہے، آج کی رات یہیں رہ جاؤ

کب تک یوں پردے پردے میں حسن محبت کو جھٹلاتا
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چھپنے والو، سامنے آؤ

دورِ خزاں میں سنتا ہوں تخلیق کا یہ آہنگِ مسلسل
کلی کلی کی نرم چٹک میں چھو لو! میری آہٹ پاؤ

مرنے سے کچھ کام چلا تو اے دم ساز، ہم بھی لیں گے
مرنا تو برحق ہے لیکن تم جینے سے باز نہ آؤ

ستمبر ۱۹۵۱ء

○

ندیمؔ اگرچہ زمانے سے سر کشیدہ رہا
نگاہِ اہلِ محبت میں برگزیدہ رہا

وہ ایک حسن، کہ چھونے سے جیسے لُٹ سا گیا
وہ ایک عشق، کہ لُٹ کر بھی نو دمیدہ رہا

بھرم ہو کچھ تو مرے آنسوؤں میں دیکھ اسے
جو راز کھل بھی گیا اور ناشنیدہ رہا

الٰہی! حشر میں انساں سے یہ مواخذہ کیوں!
تو نارسیدہ رہا، وہ فریب دیدہ رہا

شکایت اپنے توکّل سے ہے، خدا سے نہیں
کہ میرا دامنِ امید ہی دریدہ رہا

خرد جو عام ہوئی، حسنِ کائنات بنی
خود اپنی دھن میں دلِ کائنات دیدہ رہا

سنا ہے، آج مشیت پہ ڈالتا ہے کمند
وہ آدمی جو ازل سے ستم رسیدہ رہا

۱۹۵۱ء

○
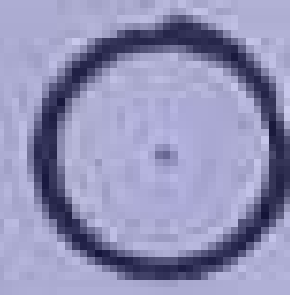
نمی میں ڈوب کے ٹھنڈی ہوائیں آئی تو ہیں
برس بھی جائیں گی آخر، گھٹائیں چھائی تو ہیں

خدا کا شکر، دھواں چھوڑتی ہوئی شمعیں
کسی خیال کے آتے ہی جگمگائی تو ہیں

لہو کے ساتھ شرارے جھڑیں تو بات بنے
بجا کہ آپ نے چوٹیں دلوں پہ کھائی تو ہیں

یہیں سے رنگِ رُخِ روزگار بدلے گا
کتھائیں دل کی بالآخر لبوں تک آئی تو ہیں

اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہو گا کیا
وہ آنکھیں آج مرے غم پہ ڈبڈبائی تو ہیں

۱۹۵۱ء

○

کیا ترے لطف کا معیار زباں بندی ہے؟
بات بے بات بدل جاتے ہیں تیور تیرے

اک ہمیں کو نہ تجھے اپنا بنانا آیا
انجمن تیری ہے، مے تیری ہے، ساغر تیرے

یہی عنوانِ کرم ہے تو زہے لطف و کرم
سانس چلتی ہے تو چلتے رہیں نشتر تیرے

میں ترا عذرِ ستم مان تو لوں گا لیکن
اس طرح اور بھی کھل جائیں گے جوہر تیرے

اے مری قوم! مرا ذوقِ سفر کفر سہی
اور اگر دائرے بُنتے رہیں رہبر تیرے!

۱۹۵۱ء

( )

رخصت کے وقت کس کے بہکنے لگے قدم
قائم نہ رہ سکا ترے پندار کا بھرم
گلشن میں جتنے پھول کھلے، زخم بن گئے
خونِ بہار سے ہے جمالِ بہار نم
کوشش کے باوجود ابھی تک نہ چھپ سکے
زلفوں کے پیچ و خم میں زمانے کے پیچ و خم
صد شکر، تو نے خواب سے چونکا دیا مجھے
صد شکر، ہو رہا ہے ترا التفات کم
ذوقِ عبودیت ہے بہر رنگ حیلہ ساز
سجدے کے ساتھ ذہن میں ڈھلنے لگا صنم
تخلیقِ فن کروں گا بعنوانِ ارتقا
جس ہاتھ میں قلم ہے اسی ہاتھ کی قسم

سنہ ۱۹۵۱ء

○

آشوب بدل، خاک بسر، جاں بلب آئے
جب آئے تری بزم میں ہم باادب آئے

جب تک تری دزدیدہ نگاہی ہے حیا بیز
کس طرح ہمیں آنکھ ملانے کا ڈھب آئے

وعدہ تو ہے شب کا، مگر اب دن نہ کٹے گا
حیراں ہوں کہ یہ آج کی شب نا نے کب آئے

آفاق میں پھولوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا
جب میرے لبوں تک کسی کافر کے لب آئے

نومیدیِ جاوید کا اللہ رے اعجاز
آئے مری آغوش میں اور بے طلب آئے

میں وقت کے ظلمات میں حیران کھڑا ہوں
اللہ! مرا انجمن افروزِ شب آئے

کیمبل پور جیل ۱۹۵۱ء

○
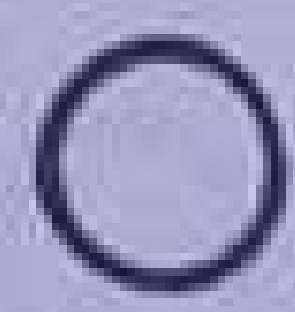
ہوتا نہیں ذوقِ زندگی کم
بنیادِ حیات ہے ترا غم

احساسِ جمال اُبھر رہا ہے
جب سے ترا التفات ہے کم

تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی
کوندے کی لپک، غزال کا رَم

سامانِ ثبات ہیں سفر میں
اُمید کے پیچ، راہ کے خم

زخموں میں چٹک رہی ہیں کلیاں
ہوتی ہے یونہی نشاط برہم

شمعوں کی لَویں ہیں یا زبانیں
آنسو ہیں کہ احتجاجِ پیہم

انجم سے کھلائے گی شگوفے
شبنم سے لدی ہُوئی شبِ غم

طوفان کا منتظر کھڑا ہے
یہ عین سحر کو شب کا عالم

ڈسٹرکٹ جیل کیمبل پور ۱۹۵۱ء

○
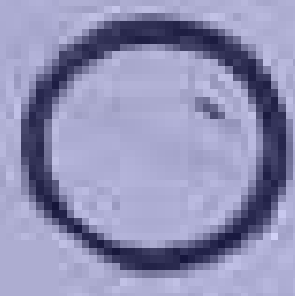
ہمہ سرمایۂ دامانِ چمن
ریشۂ گل ہو کہ سورج کی کرن

ہمہ اضداد ہے کردارِ جمال
صبح کا نور ہے تاروں کا کفن

ٹوٹتا ہے جو ستارہ کوئی
پھیلتی ہے مرے ماتھے کی شکن

وقت کی آنکھ بنا جاتا ہے
تیرہ و تار قفس کا روزن

آج کچھ ذکر رفو کا بھی چلے
کب تلک چاک کروں پیراہن

مجھ کو آنکھوں کی چکا چوند سے کام!
ذہن روشن ہے تو دنیا روشن

ہم نہ بدلیں گے اگر اپنا آپ
کون بدلے گا زمانے کے چلن

رات کو آگ نہ لگ جائے کہیں
آنچ دیتے ہیں ستاروں کے بدن

فن کے صحراؤں پہ ساون کی گھٹا
میرا بدلا ہوا اندازِ سخن

۱۹۵۲ء

○
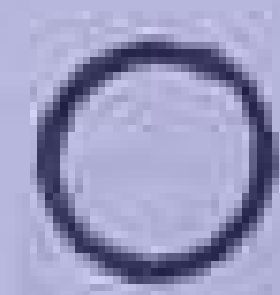
بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے
ہجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

بہ فیضِ لذّتِ تخلیق، خون ہو کے کلی
خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

وفورِ رنگ میں گھلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گل کو اگر آئینہ دکھاتی ہے

یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے گھبرا کر
نگارِ شام حیا سے لٹیں گراتی ہے

یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات
چٹک کلی کی، ستاروں کو گدگداتی ہے

یہ رودِ آب، یہ تارے، یہ شہرِ لالہ و گل
ابھی وہ آنہ چکے اور رات جاتی ہے

۱۹۵۲ء

○
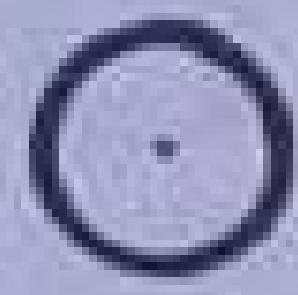
میرے ہونٹوں پہ نہیں تیرے گلے
یہ تو ہیں عرضِ محبت کے صلے

چلمن اُٹھی کہ خزاں ختم ہوئی
آج تو پھول سرِ بام کھلے

چاک مہکے، مگر اے فصلِ بہار
ریشۂ گُل سے گریباں نہ سِلے

وقت ساکن بھی ہے، جولاں بھی ہے
چاند جس طرح ببولوں میں رہے ہلے

غیر فانی ہی رہیں امّیدیں
جب بھی یہ زخم سلے اور چھلے

جستجو موت سے کیا بہلے گی
ٹوٹ کر بھی تو ستارے نہ ہلے
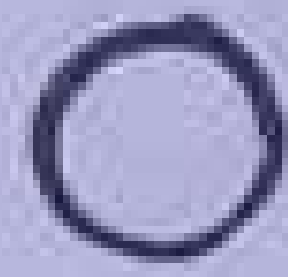
۱۹۵۲ء

○

رہے اسیرِ قفس در قفسِ بہار ہیں ہم
مگر حقیر نہ سمجھے چشمِ روزگار ہیں ہم

کسی نے جس میں امیدِ سحر دلائی تھی
بھٹک رہے ہیں اسی رات کے غبار ہیں ہم

وہ ایک درد بنا زندگی کا سرمایہ
جسے پرو نہ سکے آنسوؤں کے تار ہیں ہم

وہ آئے بھی تو بگولے کی طرح آئے گئے
چراغ بن کے جلے جن کے انتظار ہیں ہم

یہ اور بات کہ انجان بن گئے، ورنہ
ترے خرام کو پہچان لیں ہزار ہیں ہم

ترا جمال ہے یا خوابِ سایۂ گُل میں
پگھل رہے ہیں اُترتے ہوئے خمار ہیں ہم

کبھی بہار بنے اور کبھی شکستِ بہار
ندیمؔ! جم نہ سکے حسن کے حصار ہیں ہم

۱۹۵۲ء

○

دمک رہا ہے رُخِ شام پر ستارۂ شام
غروبِ مہر پہ اب کون دھر سکے الزام

اس ایک پل میں یہاں ایک عمر بیت گئی
تری نگاہِ کرم ہے کہ گردشِ ایّام

گُلوں کے اُڑتے ہُوئے رنگ کی تلاش میں ہوں
یہی نہ ہو مرے ذوقِ جمال کا انجام

بایں خمار، زمانے کا ساتھ دیتا ہوں
زمیں سے اُٹھ نہ سکا میری سرخوشی کا مقام

یہ سوچتا ہوں کہ پھُولوں کے رقص کی بنیاد
نہ جانے بادِ چمن ہے کہ تیرا حسنِ خرام

بھٹک رہا ہوں حقیقت کی تیرگی میں، مگر
چراغِ فکر ہے اب تک مرا گلاب اندام

کسی کی تشنہ لبی رنگ لا رہی ہے، کہ آج
لہو لہو ہے ترے ہاتھ میں شراب کا جام

ضرور دامنِ شب سے ڈھلک رہی ہے سحر
کہ بھیجتے ہیں ستارے بھی تیرگی کو سلام

ندیمؔ سینۂ گیتی سے جب بھی ہُوک اُٹھی
مری نگاہ جمی رہ سکی نہ بر سرِ بام

۱۹۵۲ء

○

قرارِ جاں بھی تمھی، اضطرابِ جاں بھی تمھی
مرا یقیں بھی تمھی ہو، مرا گماں بھی تمھی

تمھاری جان ہے نکہت، تمھارا جسم بہار
مری غزل بھی تمھی، میری داستاں بھی تمھی

یہ کیا طلسم ہے، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رُکے ہُوئے بھی تمھی ہو، رواں دواں بھی تمھی

خدا کا شکر، مرا راستہ معیّن ہے
کہ کارواں بھی تمھی، میرِ کارواں بھی تمھی

تمھی ہو جس سے ملی مجھ کو شانِ استغنا
کہ میرا غم بھی تمھی، غم کے رازداں بھی تمھی

نہاں ہو ذہن میں وجدان کا دھواں بن کر
افق پہ منزلِ ادراک کا نشاں بھی تمھی

تمام حسنِ عمل ہوں، تمام حسنِ بیاں
کہ میرا دل بھی تمھی ہو، مری زباں بھی تمھی

۱۹۵۲ء

○
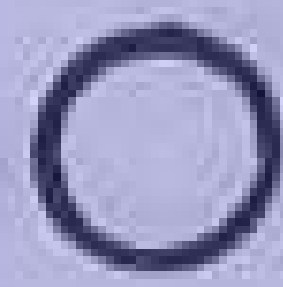
لپکیں گے پلٹ کے پھر وہاں سے
بھٹکے تھے یہ کارواں جہاں سے

اِک ٹیس فضا کے دل میں اُٹھی
یا تیر نکل گیا کماں سے

بیداریٔ شب کے بدلے ہم نے
دن پائے، مگر دھواں دھواں سے

ہر گل ہے پناہ گاہِ زنبور
گل چیں کو گلہ ہے باغباں سے

پھولوں کی بھی خاک اُڑا رہے ہیں
لپٹے ہیں جو دامنِ خزاں سے

جو پیار نہ کر سکے زمیں سے
پائیں گے نہ بھیک آسماں سے

کچھ اور نہیں تو حشر ٹوٹے
اب خواب تو ہو چلے گراں سے

ہم آبلہ پا ہی، اے زمانے!
اُلجھیں گے ترے یمِ رواں سے

اُڑتا ہے مذاق بجلیوں کا
اب پھول گریں گے آسماں سے

یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس
انسان ہٹا جو درمیاں سے

گنجینۂ وقت بن گئی ہے
جو بات نکل گئی زباں سے

۱۹۵۲ء

(۶)

متفرقات

مطلعے

ہر ایک شے پہ اُجالا سا ہلکا ہلکا ہے
ترا خیال ہے یا صبح کا دھندلکا ہے

○
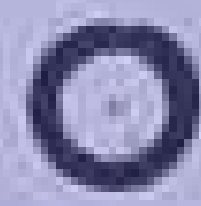
چاند ہے، پھول ہیں، لبِ جُو ہے
میرے پہلو میں دل نہیں، تُو ہے

○
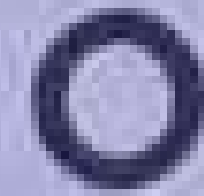
لُٹ کر بھی کوئی دشتِ جنوں کی نہ راہ لے
اپنی شکست ہی میں محبت پناہ لے

○
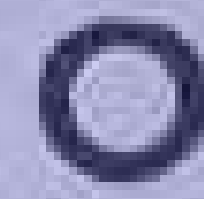
یہ کون دور سے دامن کشاں گزرنے لگا
چراغ لو کو ہَوا کے سپرد کرنے لگا

○

کرن کا رنگ فریبِ نگاہ ہوتا ہے
ثواب اصل میں عذرِ گناہ ہوتا ہے

جب بھی جی میں امنگ پاتا ہوں   اک کلی زیرِ سنگ پاتا ہوں

○
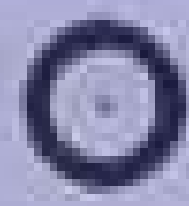
جس قدر رنگ اختیار کیے   صرفِ ہنگامۂ بہار کیے

○

مسلسل سرخوشی مرگِ مسلسل ہوتی جاتی ہے
کہ تیرے قرب سے اک عمر اک پل ہوتی جاتی ہے

○
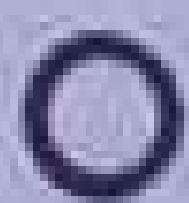
خمِ ابرو خمِ محراب نہ تھا   یہ تو اک واقعہ تھا، خواب نہ تھا

○
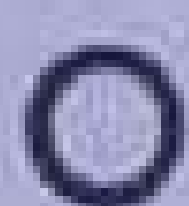
عشق سے گرمیاں حیات کی ہیں   سب تفاصیل ایک بات کی ہیں

○
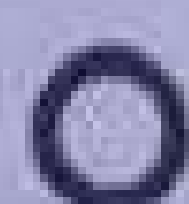
منعکس ہے حباب میں مہتاب   دونوں ضوریز، دونوں پابہ رکاب

○
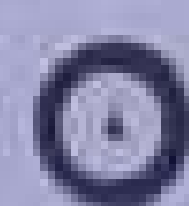
رقصاں ضمیرِ دہر میں کیسی امنگ ہے
ہر پل رخِ جہاں پہ نئی موجِ رنگ ہے

شاید یہی تضاد قیامت کی جان ہے
فطرت ضعیف ہے مگر انساں جوان ہے

○
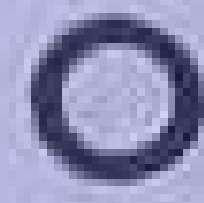
سفینہ جب اپنے سہارے چلا
زمانہ کنارے کنارے چلا

○
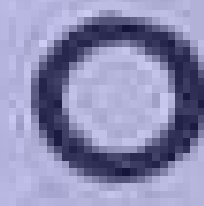
کس درجہ منحنی نظر آتے ہیں دور سے
وہ قافلے جو رک نہ سکیں گے حضور سے

○
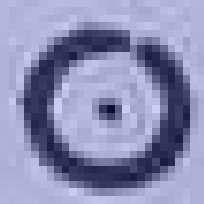
کتنا بلند، کتنا انوکھا مقام ہے
انساں اک تسلسلِ شیریں کا نام ہے

○
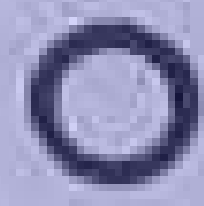
معمارِ انقلاب و ضمیرِ عوام ہو
آزاد مملکت کے اسیرو! سلام ہو

○
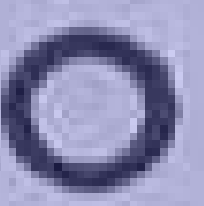
زندگی کے سانچے میں جو نظام ڈھلتا ہے
زندگی کے سانچے کو توڑ کر نکلتا ہے

وہ جن کو لوگ حقیقت پرست کہتے ہیں
حقیقتوں کے تصوّر میں مست رہتے ہیں

○

جاگنا ہے ابھی بہاروں کو　　نیند کیوں آ چلی ستاروں کو

○

بہارستانِ آزادی میں ہر گل شعلہ گوں کیوں ہے
ہجومِ رنگ میں رچتی ہوئی سی بوئے خوں کیوں ہے؟

○

عجیب درد بھری لذّتیں بہاریں ہیں
کہ جتنے پھول ہیں، شبنم کے انتظار میں ہیں

○

کتنا رنگیں مرے فن کا مجھے انعام ملا
مرحبا زخم شماری! کہ بڑا کام ملا

○

تمھیں خلعت کے بدلے فرشِ پا انداز ملتا ہے
یہیں سے بات کھلتی ہے یہیں سے راز ملتا ہے[۱]

---

[۱] پاکستان کے چند شعراء کو شاہِ ایران نے قالین بھجوائے تھے۔

مسافرو، کوئی شب بیکراں نہیں ہوتی یہ ظلمتوں کی پہیلی کہاں نہیں ہوتی

○

چمن میں اہلِ چمن درپئے چمن ہوں گے
خبر نہ تھی کہ بہاروں کے یہ چلن ہوں گے

○

اگرچہ مسلکِ ماضی رہا ہے آگ ہی آگ
اجڑ سکا نہ مگر مادرِ زمیں کا سہاگ

اشعار

تجھے نصیب ہو تیری بہار سامانی مری خزاں سے مگر قصۂ بہار نہ پوچھ

○

ہنسے تو مجھ پہ ہنسے اور وہ بھی برسرِ عام
سُنا ہے آپ تو ڈرتے تھے جگ ہنسائی سے

○

تم اتنی دور سے چل کر مرے قریب آئے
تو اب قریب ہی بیٹھو تھکن مجھے دے دو

وہ روشنی جو تیرے تبسم نے عام کی
سمٹی تو ان دنوں مرے اشکوں کی ضو میں ہے

○

مسکرانے کا یہی انداز تھا
جب کلی چٹکی تو وہ یاد آ گئے

○

کچھ درگذر کا طیش، کچھ ایثار کا کمال
ورنہ وہ کون ہے جو کسی سے نباہ لے!

○

تفسیرِ زندگی تھا یقیناً مرا سکوت
میں شرحِ داستاں کا مگر مدعی کہاں
میری وفا کو سارے جہاں کے ستم قبول
تیرے کرم کو ایک نظر کا زیاں گراں

○

نجوم دور سہی، کارواں نواز تو ہیں — نگہ نہیں تو گمانِ نگاہ کیا کم ہے
غلط ہے غلغلۂ زہد و اتقا کہ ندیمؔ — گناہگار نہیں۔ یہ گناہ کیا کم ہے

بہت قریب نہ آؤ، کہ دُور سے بھی ہمیں
وہ آنچ آئی کہ مرجھا گئے دلوں کے چمن

○
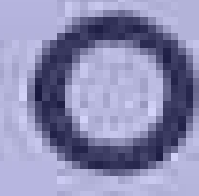
زیست تم، زیست کا تقاضا تم
اور کس سے کریں شکایت ہم

ابدیت یہی جمود نہ ہو
آؤ برپا کریں قیامت ہم

اے ستارہ نشیں! چمن پیما!
مانگتے ہیں ثبوتِ وحدت ہم

انجمن ساز! انجمن آگاہ!
جل بجھے مثلِ شمعِ خلوت ہم

○
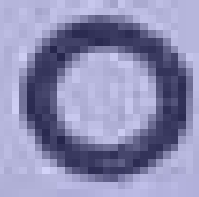
یوں بھی ہوتا ہے کہ طوفان کی زد میں آکر
بادل اُمڈے ہوئے طوفان پہ چھا جاتے ہیں

○
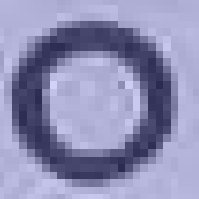
تجھے یقیں کہ ترا حسن ہے سپردِ نقاب
مجھے یہ فکر کہ تارے چھپے نہیں رہتے

○
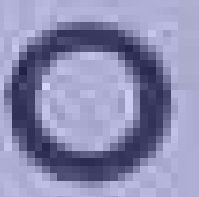
مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

صبح کی دھن میں ستاروں کو بجھایا میں نے
قبل از وقت مگر پَو کا بکھرنا معلوم!

○

اپنے ذوقِ نظر کا ماتم ہے تیرگی ایک سیلِ نور بھی

○

کئی چراغ کئی آئنوں میں عکس فگن
میں راہ بھول گیا تھا اسی چراغاں میں

○

ایک صحرائے بیکراں ہے جہاں وقت اک بے قرار آہُو ہے

○

جس کے موڑوں پہ لٹایا گیا انساں کا سہاگ
میں تو اس راہ کو تلووں کا لہو تک بھی نہ دوں

○

سجدہ اظہارِ ماندگی ہی تو ہے سانس پھولی تو لو خدا سے لگی

○

جیتے ہیں جو مرنے کی تمنا میں ندیم
وہ موت سے پیشتر ہی مرجاتے ہیں

سکوں میں رقص کناں، رقص میں سکون پذیر
خرامِ حسن کا آئینہ ہے خرامِ حیات

○

یہ کیا طلسم ہے، آئے ہو تم چمن بکنار
مگر چمن کے چمن انتظار کرتے ہیں

○

کوئی کلیم نہیں آج دہر میں ورنہ
جبینِ حضرتِ انساں میں طور کی لَو ہے
یہ اور بات کہ جلتا ہے قصرِ سلطانی
یہ آگ آگ نہیں، پھُوٹتی ہوئی پَو ہے
بھلا سحر بھی چھپائے سے چھپ سکی ہے ندیمؔ
گھٹا کے حاشیے پر آفتاب کی ضَو ہے

○

وہ کفر ہے ایمان کی معراجِ کمال
جس کفر کو انساں سے محبت ہو جائے

—

عنفوانِ شباب

شبنم آئینہ بدست آئی سرِ برگِ گلاب
ایک معصوم کلی
شاخساروں سے مہک کر نکلی
آئینہ دیکھ کے شرمائی، لجائی، کانپی
جھرجھری لے کے سنبھلنا چاہا
لیکن احساسِ جمال
ایک کوندا ہے جو لپکے تو لپکتا ہی چلا جاتا ہے
اور معصوم کلی
کپکپاہٹ کے تسلسل سے چٹکنے پہ جو مجبور ہوئی
چُور ہوئی
غنچہ تخلیق ہوا
آئینہ چونک اٹھا

گونج

رات کا پُر وقار سنّاٹا
گونجتی ہے صدائے پائے نجوم
اصل میں گونج ہے سکوت کا گیت
اور ہے کس قدر لطیف و بسیط
گونج ہی گونج کبریا کی ذات
گونج ہی گونج ماورائے حیات
یہ حقیقت مگر کسے معلوم!

زندگی گونج کے سوا کیا ہے
ایک انسان، دوسرے کا نقیب
پھول کی گونج پھول کی مہکار
اور یہی ہے اشارۂ گلزار
ایک ایک پھول گلستاں کا غرور
ایک ایک آدمی جہاں کا غرور
کاش سب کو مری نظر ہو نصیب!

(اقتباس)